فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۵۲

جولائی سنہ ۱۹۴۳ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ۵۲

جولائی سنہ ۱۹۴۳ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۵۲ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۲ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلمانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے، باوجود طریق اظہار خیال و تعبیر کے اختلاف اور تعدد کے ان میں یکرنگی اور یکسانی نمایاں ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مسلمانوں میں اس انقلاب کا بیج مولنٰنا ابوالکلام اور اُن کے الہلال نے بویا تھا، ان کی اصطلاحِ توحید کی تعبیر یہ تھی کہ ایک کے آستانہ پہ سر رکھ کر ہر چوکھٹ سے بے نیاز ہو جانا، خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خلافت الٰہی کی تعبیر مختلف طریقوں سے کی گئی، مگر بالآخر اس کا منشا یہ تھا کہ نوعِ انسان اس خلافت سے سرفراز ہے، اور اسی خلافت کے فرض کا ادا کرنا دین ہے، اور خلیفہ اس دین کا انتظامی مرکز و امام ہے، مولنٰنا محمد علی مرحوم نے اسی سے کنگڈم آف گاڈ کی فلاسفی پیدا کی، اور اسپر وہ ایک مستقل تصنیف اپنے زمانۂ قید میں لکھنا چاہتے تھے، اور کئی سو صفحے لکھے بھی مگر اُن کی آپ بیتی کی تمہید اتنی پھیلی کہ جگ بیتی کی نوبت نہ آئی، تاہم یہ اُن کی تقریروں کا موضوع برابر رہا،

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۶ء میں خودی اور بیخودی کے اسرار فاش کئے، اور مسلم کامل اور مردِ غازی کے وہ فلسفیانہ اصول بتائے جس سے ایمانِ کامل، یقین محکم اور عمل پیہم پیدا ہو، جس سے مسلم قوم کی دینی و سیاسی زندگی تکوین پائے، اور اس کو روئے زمین کی امامت اور پیشوائی کا درجہ حاصل ہو، اور یہ ثابت کیا کہ اسلام وطنیت کی حدبندی سے آزاد اور ایک ایسی حقیقت ہے جو بجائے خود مستقل اور دوسروں کی دست نگری اور آمیزش سے پاک ہے، اسلامی خلافت وہ ہے جو اپنے دست و بازو سے حاصل کی جائے، نہ کہ جس کی دوسروں سے بھیک مانگی جائے، اور یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ایک مستقل قوم ہیں جن کی خصوصیات

امتیازات اور تعمیری مقاصد دوسری قوموں سے بالکل الگ ہیں،

مشرقی صاحب نے تذکرہ لکھا جس میں لغویات کو حذف کر کے اگر دیکھا جائے تو منشا وہی استخلاف فی الارض کا حصول اور اس کے حصول کے لئے اصول ہے، اور اسی پر خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی ہے، مگر چونکہ اس کا بانی دین کے اصول و مبانی سے واقف نہ تھا اس لئے حق و باطل کی آمیزش سے اسکو دوچار ہونا پڑا،

ہمارے مشہور مفکر دوست مولانا آزاد سبحانی بھی پورب کے شہروں میں دعوتِ کلمہ کے نام سے ایک تحریک عرصہ سے چلا رہے ہیں اور لا الٰہ الا اللہ کے معنی و مقصود کو اس وسعت کیساتھ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں، جس میں خدائے برحق کی بادشاہی کے سوا ہر بادشاہی کا ابطال ہو اور اسی واحد کلمہ کو وہ سیاسیات اور دینیات کا عظیم الشان سنگم قرار دیکر اپنے پورے فلسفۂ تعلیم کا مرکز ٹھہراتے ہیں،

چند سال سے مولنٰنا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جس جماعتِ اسلامی کی بنا رکھی ہے، اور اس کے متعلق جو اصول و مبادی انھوں نے تحریر فرمائے ہیں ان سب کا منشا بھی خلافتِ انسانی اور حکومتِ الٰہی کو مرکز قرار دیکر پورے اسلام کو ایک عظیم الشان تحریک ٹھہرانا جس کی دعوت لیکر مسلمان پھر کھڑے ہوں،

کلکتہ میں صوفی نذیر احمد صاحب اسی کام کو مسلم لیگ کے زیر سایہ اور مسٹر محمد علی جینا کے زیر قیادت انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اجلاسِ دلی کے موقع پر گیارہ مسلمان لیڈروں کے دستخط سے ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں دو تجویزیں پیش کی ہیں، ان میں سے اول تعمیر ملی کے لئے ایک مرکزی مجلس کا قیام ہے، جس کے ذریعہ سے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان کی ایسی تشریح کی جائے جس سے مسلم سوسائٹی، مسلم نظامِ معاشیات، ملی سیرت و تعلیم، تہذیب و تمدن کی اسلام کے اساسی اصول کے مطابق اصلاح و ترقی کی تحریکات کی اس طرح ہدایت و رہنمائی کیجائے کہ اُن کے ذریعہ ایک حقیقی اسلامی اسٹیٹ اور ہیئتِ اجتماعی کی تجدید کا نصب العین حاصل ہو سکے،

تجویز دوم کا مقصد یہ ہے کہ لیگ میں شعبۂ اسلامیات و اصلاحِ تمدن و معاشرت یا شعبۂ تبلیغ و اصلاح

وترتیب دین قائم کیا جائے جس سے مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی نشاۃ جدیدہ کیلئے تبلیغ عام اور تعلیم عام (ماس ایجوکیشن) اور معاشرتی اصلاحات کی تحریکات اس طرح جاری ہوں کہ اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات پر عوام کا شعوری ایمان پختہ اور عمل راسخ ہو جائے، ہم کو معلوم نہیں کہ دلی میں ان تجویزوں کا کیا حشر ہوا، تاہم مسلمانوں کے اس ذہنی انقلاب کا ایک منظر یہ بھی ہے،

خود مسلم لیگ کے اندر پاکستان کی سیاسی حقیقت کی تعبیر میں اسکے مذہبی و روحانی عناصر کا رجحان روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور اسلامی نظام حکومت، نظام معاش، نظام اقتصاد اور نظام تعلیم کے خاکوں کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہوتا جا رہا ہے،

ابھی حال میں علی گڈھ اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئی اسلامی جماعت کے قیام کی اطلاع ملی ہے جس میں مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کے اتحاد سے اسلامی تعلیم و تمدن کے احیاء کی تجویزیں منظور کی گئی ہیں، اور اس مجلس کی وسعت کو پورے ملک میں پھیلانے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے جس میں سُنّی اور شیعہ دونوں شریک ہوں،

ان تجویزوں سے جو مختلف حلقوں سے نکلی ہیں، اور مختلف بانیوں اور مجوزوں کی طرف منسوب ہیں، اس بازگشت کا اندازہ ہوتا ہے، جو یورپ کی تقلید عام کے پرانے تخیل کی جگہ لے رہی ہے، اور جس کا ہم بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں، جزئی اختلافات سے قطع نظر کرکے یہ بات دیکھنے کی ہے، کہ گذشتہ تحریکوں کی طرح اسکی بنیاد فوری جوش و خروش اور ہنگامی زود اشتعالی پر نہیں ہے، بلکہ آہستہ آہستہ ایک صحیح عقیدہ اور آئیڈیالوجی پیدا ہو رہی ہے جو ایک دن امید ہے کہ صحیح راستہ پائیگی، اور اس کی بنیاد پر عمل کا جو خاکہ تیار ہوگا وہ سارے افراد ملت کو دین و سیاست کے باہمی ربط و ضبط پر استوار کرکے اس کے حصول کے لئے ان میں نئے جوش، نئے عزم اور ایثار و قربانی اور جد و جہاد کے جذبات پیدا کردے گا، انشاء اللہ تعالیٰ، لیکن صرف اتنی ترمیم رکھی جائے کہ سیاست کو دین کا درجہ نہ دیا جائے یعنی قوت کا مقصد حصول دنیا نہ ہو، بلکہ رضائے الٰہی کی طلب ہو جسکی وسعت میں دین و دنیا کی سعادتیں جمع ہیں،

مقالات

کتاب اسلامی معاشیات کا ایک باب

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۴)

"اسلامی معاشیات پر مولٰنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا جو مضمون معارف میں مسلسل نکل رہا تھا گذشتہ نمبر میں اسکا سلسلہ ختم ہو گیا اس سلسلہ کا ایک ٹکڑا رسالہ دار العلوم میں نکلا تھا مضمون کی تکمیل کیلئے آخر میں اسے بھی نقل کیا جاتا ہے" "م"

اسلامی معاشیات جو میرے اس مقالہ کا عنوان ہے، قبل تفصیلی مباحث کے میں چاہتا ہوں کہ پہلے معاشی سہولتوں کے ذرائع یا عاملین پیدائش (Factors of production) اور ان سے استفادہ کے متعلق اسلام کا جو نقطۂ نظر ہے اس پر ایک اجمالی تبصرہ اسلامی وثائق و مستندات کی روشنی میں کر لوں آیندہ مباحث کے سمجھنے میں انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بڑی مدد ملے گی،

معاشی وسائل کی نشان دہی انسان کے اندر اور باہر

واقعہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جن بے پناہ تسخیری قوتوں کا پتہ قرآن نے اپنے مشہور مسئلۂ "خلافت" میں دیا ہے، اور ان قوتوں کی بنا پر آدمی سے "باہر" صرف زمین ہی ہی نہیں بلکہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی پیداوار ون پر

رزقاً للعباد (ق ع ۱) روزی بندوں کے لئے

کی قدرتی مہر لگا کر نسلِ انسانی کے رزق اور معاشی نظام میں جو غیر محدود فراخی اور بے تھاہ کشادگی پیدا کی ہے اگر
اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو شیخ سعدی کی مشہور تعبیر ؎

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ درکارند — تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

کی بنیاد پر یہ کہنا قطعاً مبالغہ سے خالی ہوگا، کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کائنات کا یہ سارا نظام "نانے بکف آری" کا نظام ہے یعنی قدرت نے اس نظم کو اسی لئے قائم فرمایا ہے، کہ اپنی معاشی سہولتوں کے لئے بالواسطہ یا بلاواسطہ آدمی استفادہ کر کے نفع اٹھائے پھر "نانے بکف آری" کے اس مہیب اور عظیم کارخانہ کو قرآن کا انسان کے سامنے رکھکر اور زمین کے اندر قوتی (غذائی مواد) کا جو ذخیرہ محفوظ کیا گیا ہے، اسکی طرف

قدر فیہا اقواتہا — ناپ تول کر رکھدیئے اقوات (غذائی ذخیرے)
(حم سجدہ ع۲) — اس کے اندر،

کے الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے

سواءً للسائلین، — برابر ہے تلاش و جستجو کرنے والوں کے لئے

کا صلائے عام، ان تمام معاشی پیداواروں کو "فضل اللہ" کے احترامی نام سے موسوم کر کے جد و جہد کی توانائیوں کو

وابتغوا من فضل اللہ، (الجمعہ ع۲) — اور ڈھونڈو اللہ کے فضل کو

کے تشریعی حکم سے بیدار کرنا، اور اس قید کیساتھ بیدار کرنا

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء — مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں
نصیب مما اکتسبن، (النساء ع۵) — اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں

تاکہ ایک طرف تو یہ معلوم ہو کہ ان معاشی ذرائع سے استفادہ کا حق نسلِ انسانی کی خاص صنف کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یہ میدان کھلا ہوا ہے، اور دوسری طرف لوگوں

کو تنبہ کر دیا گیا کہ قرآن کا مشہور قدرتی قانون

لیس للانسان الا ما سعیٰ وان سعیہ — نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کمایا
سوف یریٰ، (النجم ع۳) — اور قطعاً اپنی کمائی کو قریب ہے کہ دیکھے گا،

کا تعلق جس طرح اُخروی معاملات اور نتائج سے ہے، اسی طرح یہ قانون دنیاوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے جیسے معادی زندگی میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہوگا جو اس نے کمایا ہے، اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجہ کی شکل میں پیش ہوگی، یونہی معاشی زندگی میں ہر ایک کا نصیب اور حصہ اسکی محنت اور مشقت کد و کاوش کی مناسبت ہی پر مبنی ہے، وہ جتنی محنت و جانفشانی کرتا ہے، اسی حساب سے وہ حصہ بھی پاتا ہے، پھر سورۃ النساء کی آیت

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل — اور نہ دیا کرو کم عقلوں کو اپنے اموال جو جسے
اللہ لکم قیاما، (النساء ع۵) — بنایا ہے اللہ نے تمہارے تھماؤ کا ذریعہ

میں "اموال" یا "سرمایہ" و اصل کو انسان کے معاشی نظام کے قیام و بقاء کا ضامن ٹھہرانا، اور اس میں محتاط رہنے کی تاکید فرمائی، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں

ان خیر من استاجرت القوی الامین — یقیناً اچھا وہ ہے جس نے نوکر رکھا، ایسا آدمی
(القصص ع۳) — جو قوت والا ہو، اور امانت والا،

کے الفاظ سے جسمانی محنت و مزدوری کی بنیاد کو دو لفظوں "القوی" اور "الامین" کے ذریعہ سے ظاہر کرنا یعنی اس قسم کے کاروبار کے لئے جس کی سرانجامی میں دماغ سے زیادہ ہاتھ پاؤں کی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے توجہ دلائی جاتی ہے، کہ صحیح نتائج کی امید اسی وقت لگائی جا سکتی ہے، جب کام کرنے والے جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ اپنے فرض اور خدمت کی بجا آوری میں خیانت اور بد دیانتی سے کام نہ لیں، بلکہ "الامین" ہوں، پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بادشاہ مصر سے انکی گفتگو ہوئی، اس گفتگو

مین سے حضرت یوسف علیہ السلام کا تنظیمی کاروبار کے سلسلہ مین یہ فرمانا کہ

اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم،	مقرر کرو مجھے زمین کی پیداوارون پر، مین نگرانی کرنے والا اور علم والا ہون،

یعنی زمین کی پیداوار (خزائن الارض) کے نظم و ترتیب اور بندوبست کے لئے جب حضرت نے اپنے کو پیش کیا، تو اس وقت تنظیمی کاروبار کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے، ان کو بھی آپ نے دو لفظون (حفیظ و علیم) کی شکل مین ظاہر فرمایا، مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے کام مین ایک تو حفظ (یعنی حفاظت و نگرانی دیکھ بھال کا سلیقہ ناگزیر ہے) دوسرے علیم (یعنی نظم کرنے والے کی معلومات کو وسیع رہنا چاہئے) گویا جسمانی طاقت سے زیادہ اس سلسلہ مین دماغی اور ذہنی سرمایہ کی ضرورت ہے، بظاہر قرآن کے یہ چند اشارے ہین، مگر میرے خیال مین یہ ایسے اشارے ہین، کہ غالباً غور کرنے والے ان مین وہ سب کچھ پا سکتے ہین، جو معاشیات کی کتابون مین آج ہزارہا ہزار اوراق کے اندر بھی عاملین پیدائش (Factors of production) یعنی زمین، سرمایہ، محنت، تنظیم کے متعلق بہ مشکل مل سکتے ہین، یا یون کہئے کہ علمائے معاشیات جن نتائج تک سالہا سال کی فکر و نظر تحقیق و تجسس کے بعد پہنچے ہین، قرآن نے چند الفاظ مین اُن آخری نتائج کو اشارون اشارون مین بیان کر دیا ہے، آیندہ ابواب مین اپنی اپنی جگہ انہی امور کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے تفصیلی بحث کیجائیگی، اس وقت ان کے ذکر سے مقصد صرف اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو عام طور پر اسلام کے متعلق بھی بعض قلوب مین پایا جاتا ہے، یعنی مذہب اور دین کے غلط نام سے مختلف اقوام و امم کے اندر جو "معاش گریز" رجحان پایا جاتا ہے، خیال کر لیا گیا ہے کہ اسلام بھی چونکہ مذہب ہے، اس لئے معاشی مسائل کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی وہی ہوگا، حالانکہ ابھی کچھ نہین کہا گیا ہے، اگر گذشتہ بالا چند سطرون مین جو کچھ بھی کہا جا چکا ہے کیا ان کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے کوئی اپنے اندر اس وسوسہ کی گنجایش پا سکتا ہے، کہ مغرب کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ میلانات کے لئے اسلام مین کوئی گنجایش پیدا ہو سکتی ہے" جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے

سب کچھ تمہارا ہے"، "اسی لئے ہو کہ جس حد تک اپنی اکتسابی قوتون کو بیدار کر کے تم اُن سے استفادہ کرنا چاہو کر سکتے ہو" اسلام کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے عام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ اس افسردہ قنوطی پیغام سے کوئی ادنی مناسبت بھی ہو سکتی ہے، جس مین غریب انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے، اس مین کچھ بھی تمہارا نہین ہے، انسانیت کا کمالی ارتقاء اسی گریز اور فرار کیساتھ وابستہ ہے، جن امور کے متعلق اختیار کیا جائے، حتی کہ اسی بنا پر صرف سنا نہین گیا ہے، بلکہ دیکھا جا رہا ہے کہ کتنون کے بدن سے کپڑے اتروائے گئے، اُن کے منہ سے لقمے چھینے گئے، ان پر پانی بند کیا گیا، بلکہ کبھی کبھی تو اس جنون نے اس حد تک ترقی کی ہے، کہ اسی آدمی کو جو ہوا کے بغیر عام فطری حالت مین غالباً چند منٹ بھی زندہ نہین رہ سکتا، اسی بیچارہ کو حبس دم وغیرہ کے نام سے "ہوا" مین سانس لینے کے حق تک سے محروم کیا گیا، غور کرنے کی بات ہے کہ ہوا پانی، کھانا وغیرہ تو خیر بڑی چیزین ہین، مگر معاشی ضرورت کے لحاظ سے جن کا درجہ اُن "حسیات" سے فروتر ہے، مثلاً الذہب (سونا) الفضۃ (چاندی) کے القناطیر المقنطرہ (ڈھیر کے ڈھیر) الخیل المسومہ (نشان زدہ گھوڑے) الانعام (مویشیان) الحرث (کھیتی) وغیرہ چیزون کے متعلق جو قرآن

زین للناس حب الشہوات من	سنواری گئی ہے آدمی کے لئے خواہشون کی چاہ
النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ	یعنی عورتون اور بیٹون ڈھیرون ڈھیر سونے
من الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ	اور چاندی، خوبصورت گھوڑون اور مویشیون
والانعام والحرث، (آل عمران ۲)	اور کھیتون کی،

کا اعلان کرتا ہو، یعنی مدعی ہو کہ جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے، اسی نے آدمی کی جبلت مین ان اُمور کی گوارائی، پیدایشی طور پر پیدا کی ہے، جیسا کہ لفظ زین کے مجہول صیغہ کا اقتضاء ہے، کہ ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حب و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر نہین پیدا کیا ہے،

بلکہ پیدا کرنے والے نے آدمی کو ان امور کے میلان اور حب کیسا تھ پیدا کیا ہو اور جو آدمی کی فطرت سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ یہی واقعہ بھی ہے، اور ان امور کو تو کسی نہ کسی حد تک ضروریات معاشی میں بھی شمار کیا جا سکتا ہو، لیکن قرآن تو صاف صاف لفظون مالابدمنہ (Necessaries) ضروریات سے گذر کر آسایش و راحت، رفاہیت و زینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتوی پر قناعت نہین کرتا، بلکہ زینت اللہ اور الطیبات من الرزق (Luxuries) کے استعمال سے گریز کرنیوالون کو اس عتابی استفہام

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ — بولئے کس نے حرام کی ہے اللہ کی آرائش

لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ — کو جسے اللہ نے اپنے بندون کے لئے پیدا کی

(الاعراف ع ۳ پ ۸) — اور صاف ستھری روزی کو،

سے مخاطب کرتا ہوا اور سوال کے بعد خود پھر فرمان نافذ کرتا ہو،

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا — بولئے یہ ان ہی لوگون کے لئے جو ایمان لائے

خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ، — اس پست زندگی مین مخص کی گئی ہو ان ہی

(الاعراف ع ۳ - پ ۸) — ایمان والون کے لئے) قیامت کے دن،

اور واقعہ بھی یہی ہو کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتون سے "الحیوٰۃ الدنیا" اور اس معاشی زندگی مین اُن سے بھاگ بھاگ کر اپنے اندر عادتی چڑھ اور کراہت پیدا کرین گے، ان کے کراہت زدہ قلوب پر اُخروی نعمتون کی قدر و قیمت کا کتنا وزن باقی رہ سکتا ہے، اور یہی وجہ ہو کہ عام مسلمانون ہی کو نہین، بلکہ مسلمانون کے سب سے بڑے روحانی پیشوا، سید الانبیاء علیہم وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیمات تک کو

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ، (التحریم ۲۸) — اے نبی کیون حرام کرتے ہین آپ اس چیز کو جسے حلال کیا ہو اللہ نے آپ کے لئے،

کے الفاظ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا، جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہو کہ "روحانیت" کے بلند سے بلند مقام تک مین اُن چیزون سے گریز جنھین قدرت نے معاشی استفادہ کے لئے پیدا کیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے مفید تو کیا ہوگا، بلکہ باعثِ ضرر ہی ہو سکتا ہو، علامہ ابو بکر بن الجصاص اسی بنیاد پر فرماتے ہین،

ان لا فضیلۃ فی امتناع اکلھا، — جن چیزون کو اللہ تعالیٰ حلال فرما چکا ہو انکے کھانے سے پرہیز کرنے مین کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہین ہوتی

(ص ۵۲ ہ جلد ۲)

اور سچ تو یہ ہو کہ جب شاہی ساز و سامان کو بھی قرآن انسانیت کے ارتقاء کی آخری منزل یعنی "نبوت" کے منافی نہین خیال کرتا، باوجود پیغمبر اور خدا کے رسول ہونے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات مین شیش محل، عرش و تخت و کرسی، محاریب و تماثیل، قدور راسیات (بڑی بڑی دیگین) صافنات الجیاد (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بناء (معمار) غواص (غوطہ زن) جنود (افواج) سب ہی چیزون کا ذکر کرتا ہو اور ان تمام امور کو قربِ الٰہی کے مقاماتِ عالیہ کے منافی نہین قرار دیتا، تو پھر مجھے ان پر تعجب نہین ہو جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانون کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہین، بلکہ حیرت ان پر ہے جو جاننے کے باوجود "اسلام مین رہبانیت نہین ہے"، اس مہمل دعوی کے ثبوت مین اپنا وقت ضائع کرتے ہین، اور بعض کمزور ضعیف روایتون سے استدلال کرکے گویا یہ باور کراتے ہین، کہ خدانخواستہ اگر یہ چند روایتین نہ ہوتین تو اعتراض کرنے والون کا اعتراض باقی رہجاتا،

---

[1] یورپ زدون کا ایک گروہ جسے اپنی یورپ زدگی کا احساس بھی نہین ہو کچھ دنون سے اس قسم کے خیالات پھیلا رہا ہو کہ بادشاہی یا ملوکیت کا اسلام سخت مخالف ہو اور اسی لئے تیس سال عہد خلافتِ راشدہ کے بعد اس کا خیال ہے تیرہ سو سال تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اپنے پیغمبر کی باغی رہی ہے، یا دوسرے لفظون مین نبوت ناکام رہی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ تیرہ سو سال کے مقابلہ مین تیس سال کی وہ بھی بہ مشکل کامیابی، کیا کامیابی قرار پا سکتی ہو، ؟ لیکن وہ قرآن کے سلیمانی قصص کا کیا جواب دیتے ہین یا اسرائیلیون پر احسان جتلاتے ہوئے "جَعَلَكُمْ مُلُوكًا"، کو بھی خدا کا احسان ٹھہرایا گیا ہو،

میرے خیال مین تو اسلام رہبانیت نہین ہے، اس کو دعوی قرار دیکر دلیل پیش کرنے کی زحمت اٹھانی ایسی بات ہے جیسے کوئی دعوی کرے کہ روشنی تاریکی نہین ہے، اور اس پر استدلال کے لئے بھی تیار ہو جائے، ایسون کے لئے جو اسلام کی طرف رہبانیت کو کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب کرنا چاہتے ہین، ان کے خیال کی تردید کے لئے قرآن جہان سے کھول کر دکھا دیا جائے، غالباً یہ کافی ہو سکتا ہے، جس کتاب کی جوہری تعلیم ہی اس پر مبنی ہو کہ قدرت نے جو کچھ پیدا کیا ہے انسان کے لئے پیدا کیا ہے، اور اس نظریہ کو مختلف پیرایہ مین بار بار ہر تھوڑی دیر کے بعد دہرایا گیا ہو، اس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے "معاش گریز" خیال کا اندیشہ کیا جائز ہو سکتا ہے؟ اگر اس کا ارادہ کیا جائے کہ قرآن نے تفصیلاً کن کن چیزون کے افادی پہلوون سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارا ہے، تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا، کہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کو نقل کرنا پڑے گا، بر و بحر، شجر و حجر، سفلیات و علویات مین آخر ایسی کونسی اہم چیز ہے، جس کے افادی پہلوؤن کی طرف قرآن نے صراحۃً یا کنایۃً اشارہ نہین کیا ہے، انسان اُن چیزون سے اپنی معاشی سہولتون کے حصول مین جن جن طریقون سے کام لیتا رہا ہے اور لے رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو قرآن باوجودیکہ کوئی خالص معاشی کتاب نہین ہے لیکن پھر بھی ان طریقون کی طویل فہرست قرآنی آیات کی روشنی مین بآسانی مرتب ہو سکتی ہے، مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، شکار کے مختلف طریقے یعنی آلات حیی سے شکار، شکاری کتون، شکاری پرندون، (باز بحری وغیرہ) سے شکار، خشکی کے شکار، دریائی جانورون کا شکار، مویشیون کی پرورش، بری و بحری جانورون، پرندون کے مختلف اجزاء گوشت، کھال، اون، بال، دودھ، شہد وغیرہ سے استفادہ، استفادہ کی مختلف نوعیتین، تجارت، تجارت کے سلسلہ مین حیوانی و غیر حیوانی بری و بحری سواریون کے ذریعہ سے مواصلات و حمل و نقل کی سہولتون کا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱) نظریہ ملوکیت اگر غلط ہے تو اُن کو ان آیتون کی کوئی نئی تفسیر تیار کرنی چاہئے، پس سچ یہ ہے کہ جمہوریت ہو یا ملوکیت اس کا حال وہی شاعری کا ہے حسنہ حسن و قبیحہ قبیح (اچھی شاعری اچھی چیز ہے، بری شاعری بری چیز ہے) اور بھلائی و برائی کا معیار یہ سب نہ تھا، قرآن ہے، انشاء اللہ ایک الگ کتاب مین اس پر تفصیلی بحث ہوگی ۱۲،

ذکر، صنعت و حرفت اور اس کے مختلف بسیط و مرکب سادہ اور پیچیدہ شعبے مثلاً آہن گری، نجاری، زرگری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معماری، سنگ تراشی، کوہ تراشی، کان کنی، غواصی، مزدوری، مزدوری کی مختلف قسمین، حکومتی ملازمت، کاروباری تنظیم وغیرہ وغیرہ تقریباً وہ ساری چیزین جن سے بعض معاشی علماء نے "معاشی نقشے" مرتب کر کے اہل علم سے داد حاصل کی ہے، جہان تک مین خیال کرتا ہون ان تختون کی خانہ پری صرف قرآنی آیات سے اگر کوئی کرنا چاہے، تو مشکل ہی سے کوئی خانہ خالی رہ سکتا ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ ان امور کی طرف بجائے وحی اور نبوت کے آدمی کی رہنمائی عقل و حواس سے کی گئی ہے اسی لئے قرآنی آیات مین ان کا ذکر جہان بھی آیا ہے، ضمناً آیا ہے، تاہم اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ معاشی امور سے قرآن مسلمانون کو کتنا قریب رکھنا چاہتا ہے، علی الخصوص زراعت و باغبانی کے متعلق قرآنی اشارات کی نوعیت ضمنی مباحث سے یقیناً ذرا زیادہ نظر آتی ہے، حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا، خصوصاً قریش مکہ، ظاہر ہے کہ اُن کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا، لیکن باوجود اس کے بار بار مختلف پیرایون مین قرآن ابر و باد، برق و رعد، لواقح (حاملہ یا مون سونی ہواؤن) بارش اور اُن کے ساتھ کسانون کے جذبات، خوف و طمع کا جو تعلق ہوتا ہے، مسلسل ذکر کرتا چلا جاتا ہے، لہلہاتی کھیتیون، ہرے بھرے گھنے باغون اُن کے مختلف موسمی حالات کا تذکرہ اس کتاب مین دہرا دہرا کر اس طرح کیا گیا ہے کہ بظاہر خیال گذرتا ہے، کہ شاید اس کتاب کا خطاب زیادہ تر اُن ہی لوگون سے ہے جو کاشتکاری اور باغبانی کے پیشون مین مشغول ہین، لوگون کا قرآن کے اس اسلوب کے متعلق خواہ کچھ خیال ہو لیکن میرا ذاتی رجحان تو یہی ہے، کہ گویا اس راہ سے مسلمانون مین انسانی معاش کے اس اہم باب سے[1] گونہ مناسبت پیدا ہوتی ہے،

[1] بخاری مین ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے، جس مین ہے کہ آلاتِ کشاورزی کو دیکھ کر حضرتؐ نے فرمایا کہ جس گھر مین یہ داخل ہوئے ہین، وہان ذلت داخل ہوئی ہے، اور اس قول کو انھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا، ظاہر ہے کہ گھرون مین آلاتِ کشاورزی یا مویشی وغیرہ جن سے گندگی پیدا ہوتی ہے، اُن کے داخل کرنے کی

خلاصہ یہ ہو کہ قرآنی خطاب کا جو دائرہ ہو رہبانیۃ جیسی معاش گریز زندگی والے یہ مین نہین سمجھتا کہ اپنے لئے
اس دائرہ مین کہان گنجایش نکال سکتے ہین، صرف یہی نہین کہ معاشی زندگی کا جو نقشہ قرآن نے پیش کیا ہو
اسی مین ان کے لئے گنجایش نہین ہو، بلکہ خود قرآن نے اس غیر فطری مسلک کے متعلق جس تاریخی حقیقت کا انکشاف
کیا ہو، اس سے تو معلوم ہوتا ہو کہ دنیا کی جس قوم کو جس زمانہ مین جو دین بھی دیا گیا، کسی دین مین بھی اس
مسلک کا مطالبہ خدا کی طرف سے کبھی نہین کیا گیا، گویا "لا رہبانیت" کی صفت صرف اسلام کے ساتھ مخصوص
نہین ہے، بلکہ بنی آدم کو خدا کی طرف سے جو دین بھی ملا ہے، کسی مین اس کی گنجایش نہین رکھی گئی ہے، قرآن
مین اس مسلک کے متعلق

رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا
عَلَيْهِمْ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا
الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ
مِنْهُمْ فَاسِقُونَ،
(الحدید ۲۷/۴)

رہبانیت جسے انھون نے خود تراش لیا ہو
نہین فرض کیا ہم نے اس کو اُن پر، پھر نگرانی
نہ کی، انھون نے رہبانیت کے (اصولون کی)
جیسی نگرانی انھین کرنی چاہئے تھی، پھر دیدی
ہم نے ان کے ایمان والون کو ان کی مزدوری
اور بہتیرے ان کے نافرمان ہیں

اگرچہ گنے چنے چند الفاظ مذکور ہین، مگر میرے خیال مین مذکورہ بالا عبارت کا ایک ایک ٹکڑا "رہبانیت"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳) اس مین ممانعت ہے، اس زمانہ مین یہود کا یہ دستور تھا کہ وہ باغون اور کھیتون مین کام
کرتے تھے، اور جیسے ہندستان کے ہندوؤن کا قاعدہ ہو کہ ان کے کسان بیل، گائے گوبر، سڑے پتے کھیتون کی ساری
غلاظتین اپنے گھرون کے آگے اور ادگرد پھیلائے رکھتے ہین حتی کہ زمین تک گوبر سے لیپتے ہین بظاہر کاشتکارون کے اس
عام عارضہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہو، دوسری حدیث میں بھی ہو کہ آپ نے مسلمانون سو فرمایا کہ اپنے افنیہ (آنگنون) کو پاک صاف رکھو،
یہود کے جیسا نہ بنا دو، قرآن مین "ازارعون" کو حق تعالیٰ نے اپنی صفت بتائی ہو، کیا اس سے متصف ہونے والا ذلیل ہو سکتا ہے؟
علماے اسلام کا ایک بڑا طبقہ زراعت کو تمام معاشی پیشون پر ترجیح دیتا ہو اگرچہ بعضون نے تجارت کو بہتر قرار دیا ہو لیکن گفتگو فضیلت مین ہو،

کی پوری تاریخ کا حامل ہو، مثلاً پہلا جزء ابتدعوھا (ان لوگون نے خود تراش لیا ہو)، ظاہر ہو کہ رہبانیت
کو بجاے کسی دین اور مذہب کے اُن نظریات مین شامل کر دیتا ہو جو براہ راست انسانی فکر و نظر کے مرہون
منت ہین، گویا یہ ایک قسم کا فلسفہ ہے، اور مختلف اقوام کے مختلف افراد نے مختلف زمانون مین مختلف عوامل
و موثرات کے ماتحت کبھی کبھی اپنی زندگی اس تخیل کے تحت گذارنی چاہی ہو، تاریخ اسکی شہادت ادا کرتی ہو،
کہ یونانیون اور رومانیون کے اشراقیین یا رواقیین اسکندریہ والون کے فلاطونیین ہندوستان کے جوگیہ
نے بطور فلسفہ کے ایک مکتب خیال کی شکل مین اس اصول کو قائم کیا،

دوسرا جزء ما کتبناھا علیھم (یعنی ہم نے اس نظریۂ حیات کا مطالبہ ان سے کبھی نہین کیا) جس کا یہی
مطلب ہو کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین دھرم وغیرہ کے نامون سے
ملتا رہا ہے، اس مین اس غیر فطری نظریۂ حیات کا کبھی مطالبہ نہین کیا گیا، اس جزء سے صرف اسلام ہی کی
تبری رہبانیت سے ثابت نہین ہوتی، بلکہ مذہب کی پوری تاریخ سے اسکی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہو، قرآن
کی اس آیت کی بنیاد پر ہر مسلمان اس کے ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہے، کہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی
دین، ابراہیمی ملت ہو یا نوحی دعوت کسی کو رہبانیت سے کچھ تعلق نہین ہے، قرآن کے اس تاریخی بیان کو
پڑھنے اور ماننے کے بعد بھی ہمین ان بزرگون پر تعجب ہوتا ہے، جو کبھی عیسائی کبھی کسی اور دین کے ساتھ اسلام
کا مقابلہ کرکے دعوی کرتے ہین کہ رہبانیت سے بے تعلقی یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہو، گویا ان کا یہی مطلب
ہوتا ہو، کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کسی دین مین کبھی اس قسم کی زندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا، کیا قرآن کے نص صریح
کی یہ خلاف ورزی نہین ہو ؟

تیسرا جزء فما رعوھا حق رعایتھا یعنی جن لوگون نے اس خود تراشیدہ فلسفہ کو اصول حیات تسلیم
کرکے اسی کے مطابق زندگی گذارنی چاہی، قرآن کا یہ تاریخی بیان ہے، کہ اس مین جیسا کہ چاہئے تھا، کوئی
کامیابی حاصل نہ کر سکا، جسکی وجہ ظاہر ہے، بعض خاص حالات مثلاً کسی شدید ناکامی یا کسی سخت شخصی یا

اجتماعی حادثہ سے متاثر ہوکر بعض زود اثر شدید الانفعال نفوس دنیا اور دنیاوی تعلقات سے دل کو سرد کرکے اس قسم کی خیالی صرف خیالی زندگی کا نقشہ طے کرینگی حد تک توطے کرلیتے ہین، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو جن فطری قوانین مین آدمی کی جبلت جکڑی ہوئی ہے، محسوس ہوتا ہے، کہ ان قوانین سے مسلسل جنگ مین انھون نے اپنے آپ کو مبتلا کرلیا ہے، ظاہر ہے کہ قدرت سے جنگ چھیڑ دینے کے بعد مسکین انسان کامیابی کی کیا توقع کرسکتا ہے، کامل استقلال اور ضد سے بھی اگر کام لیا جائے، پھر بھی پوری کامیابی قطعاً ناممکن ہے، اور یہی خبر قرآن ان کے متعلق دیتا ہے،

چوتھا جزء، فاٰتینا الذین آمنوا منھم اجرھم یعنی ان مین جو ایمان والے ہین، ان کو اپنی مزدوری مل جاتی ہے، لیکن اس کا کیا مطلب ہے ؟ کیا جن غیر ضروری مشقتون کو وہ برداشت کرتے ہین، اس مین جس حد تک کامیابی ہوتی ہے، اسکی مزدوری ان کو مل جاتی ہے، بہ ظاہر یہی خیال گذرتا ہے، لیکن اگر واقعی قرآن کا یہی مطلب ہوتا، توچاہئے تھا کہ "الذین آمنوا" (یعنی ان مین جو ایمان والے ہین) کی جگہ کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی کہ ان مین جن لوگون نے اس اصول کی نگرانی کی یعنی "الذین رعوا" انھین ان کا اجر دیدیا گیا، مگر جب یہ اسلوب یہان نہیں اختیار کیا گیا، تو یہی سمجھا جاسکتا ہے، کہ ان لوگون کو صرف اپنے ایمان کا معاوضہ ملتا ہے، باقی جن غیر فطری مشاغل اور حالات مین اپنے آپ کو مبتلا کرکے جو دکھ اور مصیبت وہ اٹھاتے ہین، چونکہ وہ خدا کی مرضی اور مطالبہ کے تحت نہین، بلکہ اپنی خواہش اور اپنی مرضی اپنے خود تراشیدہ فلسفہ کے زیر اثر اٹھاتے ہین، اس لئے خدا کے پاس اگر اس کا کچھ اجر نہ ہو، تو عقلاً دوسرا اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، پس ان کو جو کچھ ملیگا، ایمان کے تحت ملیگا، اور یہ حال تو ان کا ہے جو اپنی اس زندگی مین ایمان اور ایمانی اقتضاؤن پر قائم بھی رہے ہون، ورنہ اس کے بعد آیت کا آخری جزء کثیر منھم فاسقون (یعنی ان مین اکثر و بیشتر فاسق ہوجاتے ہین) یہ تو ہر ملک کی اشراقیت اور رہبانیت کے آخری انجام کی ایک ایسی رپورٹ ہے کہ اسکی تفصیل کے لئے غالباً دفتر کے دفتر درکار ہین، کلیسا اور پاپائی نظام کی پوری گھنونی تاریخ ہندوستانی جوگیون، یوگیون، بھکشون، منگون، وام مارگیون اگھوڑیون

وغیرہ کے ہزارہا ہزار سال کے ناگفتہ بہ حوادث و واقعات دہرانے پڑین گے، سچ یہ ہے کہ قدرتی قوانین سے جنگ کرنے کا آخری انجام اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، جہان تک واقعات سے معلوم ہوا ہے، اور قرآن کی ترتیب کا بھی یہی اقتضا ہے، کہ ابتدا ءً مین جو اپنے کو اس زندگی مین ڈالدیتے ہین، تازہ جوش اور تازہ تاثرات کے تحت ایک حد تک وہ تو نباہنے کی کوشش کرتے ہین لیکن انہی بے چارون کی ظاہری شکل وصورت اختیار کرکے جو ان کے جانشین بنتے ہین، چونکہ ان تاثرات سے وہ قطعاً خالی ہوتے ہین، بلکہ عام طور پر عوام مین اس عجیب وغریب زندگی رکھنے والون کے متعلق جو حسن ظن پایا جاتا ہے، اس کو دیکھکر اس گروہ مین شریک ہوجاتے ہین اسلئے اپنی ظاہری راہبانہ شکل وصورت کو جس سے بظاہر "ترک دنیا" کا یہ اعلان کرتے ہین، اسی کو پوری طاقت کیساتھ حصول دنیا کا ذریعہ بنالیتے ہین جن کے یہ جانشین ہوئے ہین، عوام کا ان کے ساتھ جو روایتی حسن ظن باقی رہتا ہے، اسی کے پردہ مین پھر یہ کرتے ہین، جو کچھ کرتے ہین، اس سلسلہ مین اُن کا سب سے بڑا نمایان جرم چونکہ ان کا معاشی جرم ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کے اکتسابی مشاغل سے الگ تھلگ ہوکر ایک طرف تو توانائیون کے اس سارے سرمایہ کو جو قدرت انھین عطا کرتی ہے رائگان اور ضائع کرتے رہتے ہین، اور ٹھیک کسی عضو کے ناسور کا جو حال ہوتا ہے کہ خون حیات کو پیپ اور ریم بناکر ایک طرف خارج کرتا رہتا ہے اور دوسری طرف دوسرے اعضاء جو اس کے قریب ہوتے ہین، ان کی غذا بھی کھینچتا رہتا ہے اسی طرح یہ اپنی توانائیون کو ضائع کرکے دوسری طرف بیچارے عوام کے گاڑھے پسینون کی کمائی کو مختلف حیلون سے باین طور چوستے رہتے ہین، کہ ان سے یہ جو کچھ لیتے ہین، اس کے معاوضہ مین ان کو کچھ نہین دیتے، چند فرضی ڈھکوسلے جن سے ان کا ضمیر خود بھی واقف ہوتا ہے، ان بیچارون کی تسلی کردیتے ہین، یہ ان کا اتنا بڑا سخت معاشی جرم ہے، کہ دوسرے فاسقانہ جرائم سے خاموشی اختیار کرنے کے باوجود قرآن نے نہایت تیز و تند لہجہ مین ان کے اس جرم کا اعلان ان الفاظ مین کیا ہے:

ان کثیراً من الاحبار والرھبان لیاکلون — قطعاً بہت سے الاحبار (علمائے یہود) اور الرھبان
اموال الناس بالباطل ویصدون — (مشائخ نصاریٰ) بلاشبہ کھارہے ہین لوگون کے

عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذھب
والفضة ولا ینفقونها فی سبیل اللہ
فبشرھم بعذاب الیم، یوم یحمی علیھا
فی نار جہنم فتکوی بھا جباھھم و
جنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم
لانفسکم فذوقوا العذاب بما
کنتم تکنزون،
(التوبہ ۵)

اموال بذریعہ باطل (جھوٹ) کے اور روکتے
ہین اللہ کی راہ سے اور جو دفینہ کرتے ہین سونا
اور چاندی نہین خرچ کرتے اسکو اللہ کی راہ مین تو
ان کو مژدہ دیدیجئے دکھ بھرے عذاب کا، اس
دن تپایا جائے گا ان پر جہنم کی آگ مین پھر داغی
جائین گی اُن کی پیشانیان اور ان کے پہلو اور
ان کی پیٹھین، یہ وہ ہے جسے تم نے جمع کیا تھا
اپنے لئے پس چکھو عذاب اس چیز کا جسے تم نے

"اکل اموال الناس بالباطل" جس کا حاصلِ مطلب یہی ہو کہ کچھ دیئے بغیر لوگون کا مال کھانا، اس الزام کو قرآن ان پر عائد کرکے ایک اہم معاشی اصول کی طرف راہنمائی کر رہا ہے، جس کا ذکر دوسرے مقامات مین متعدد بار کیا گیا ہو یعنی بظاہر قرآن کا یہ نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی اپنی جگہ نظام جسدی کی خدمت انجام دیتا ہو، اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو جسم سے آپریشن کرکے جدا کر دیا جاتا ہے، اسی طرح جماعتی جسد کا جز بنکر فرد کو جینے کا حق عمومی طور پر اسی وقت حاصل ہوتا ہو کہ جس طرح یہ دوسرے فرد سے نفع اٹھاتا ہے، اسی طرح چاہئے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق یہ بھی دوسرون کو خواہ کسی شکل مین ہو نفع پہنچائے اور ظاہر ہے کہ عام معاشی نظام کی بنیاد اسی لین دین پر مبنی ہے، مثلاً کاشتکار غلہ دیتا ہے، پارچہ باف کپڑے بنتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، معلم علم تقسیم کرتا ہے، لیکن جن جانشینون کی بزرگان سے عوام کو حسنِ ظن ہوتا ہو اور اسی حسن ظن کی بنیاد پر اُن سے جو یہ مال لیکر کھاتے ہین، کبھی انھون نے یہ بھی سوچا کہ اسکے معاوضہ مین اس غریب عامی کو مادی شکل مین نہ سہی، کسی اور شکل مین مثلاً ذہنی، عقلی، روحانی کسی فائدہ کی شکل مین کیا دیتے ہین، ؟ سب کا حال تو یہی نہین ہے لیکن جیسا کہ قرآن کا بیان ہو ان کی اکثریت یہ

واقعہ ہو کہ کسی کو کچھ نہین دیتی، اور جہان تک میرا خیال ہے، یہ خود بھی جانتے ہین کہ ہم کچھ بھی نہین دے رہے ہین، "اکل اموال الناس بالباطل" کی آخر اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی ہے، چور بھی مثلاً کچھ دیئے بغیر لوگون کا مال لے اڑتا ہو، لیکن اس چوری سے غریب بدنام مجرم چور کی چوری کو کیا نسبت ؟

یہان تک اس طبقہ کی اکثریت کے معاشی جرم کا ذکر ہے، آگے اسی غلط معاش کے حصول مین جن اعتقادی اور ایمانی شرارتون کے یہ مرتکب ہوتے ہین، غریب عوام پر جہل کا کمل اڑھا کر اللہ کی سیدھی راہ سے لوگون کو جن جن خاص طریقون سے یہ روکتے ہین، اسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے، چونکہ اس کا تعلق معاشی مسائل سے نہین ہے، اس لئے اسکی بحث یہان غیر ضروری ہے، البتہ اس کے بعد ایک اور طبقہ کا ذکر ہے جو زائد از ضرورت آمدنی کو خدا کے بتائے ہوئے صحیح مصارف[1] مین خرچ کرنے کی جگہ "کنز" کرتا ہے یعنی آج جمع کرتا ہے، دوسری زندگی مین جن حالات سے اُسے دوچار ہونا پڑے گا، اسکی تفصیل کی گئی ہے لیکن اس طبقہ کا "رہبانیت" والون کیساتھ ذکر یقیناً اپنے اندر کوئی مناسبت رکھتا ہے، بظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ راہبانہ زندگی بسر کرنے والون کی اکثریت جس طرح اپنی خداداد توانائیون کے سرمایہ کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یون ہی ضائع کرتی رہتی ہے، اور اپنی انفرادی قوت سے جماعتی جسد کی کوئی خدمت

---

[1] آیت قرآنی ولا ینفقونها فی سبیل اللہ (نہین خرچ کرتے ہین اوس کو اللہ کی راہ مین) یہ اسی کا حاصل مطلب ہے، علماء کا اگرچہ اس پر اب اتفاق ہے، کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے یعنی اموال پر شریعت نے جو زکوٰۃ فرض کی ہے، وہی مراد ہے ان کا خیال ہے کہ فرض زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد جو روپیہ جمع کرتا ہے، وہ ان سزاؤن کا مستحق نہین ہو، جن کا ذکر اس کے بعد کیا گیا ہے، لیکن صحابیون مین حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ زائد از ضرورت روپیہ کے کنز کرنیکے سرے سے مخالف تھے تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب "الغفاری" جس مین بتایا گیا ہے کہ مطلقاً مال جمع کرنے کو حضرت ابوذرؓ حرام سمجھتے تھے، یہ خیال صحیح نہین ہے، بلکہ ان کے خیال کی بنیاد ایک اہم معاشی اصول پر مبنی ہو، اس مسئلہ کے تفصیلی مباحث کا ذکر آیندہ قانونی ابواب مین بھی آئے گا، ۱۲،

انجام نہین دیتی، اسی طرح زائد از ضرورت آمدنی والے اپنے مالی سرمایہ سے بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنا
بناکر اس کے افادی پہلوؤن کو ضائع کرتے رہتے ہین، دونون طبقون مین یہی اشتراکی مناسبت ہے، کون
کہہ سکتا ہو کہ آیندہ جن اُخروی سزاؤن کا ذکر فرمایا گیا ہے، اگرچہ بظاہر ان کا تعلق کنز والون سے معلوم ہوتا ہے
لیکن جب دونون کے جرم کی نوعیت مین تناسب ہو، تو کیا سزا کی نوعیت مین بھی تناسب نہ ہو گا؟ بلکہ کنز والے
اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے نفع نہین پہنچاتے، تو کچھ دیئے بغیر لوگون کا مال بھی، تو نہین کھاتے، لیکن احبار
و رہبان کی اکثریت جیسا کہ گذر چکا، "اکل اموال الناس بالباطل" کے جرم مین بھی مبتلا ہے، اور اس لحاظ
سے اس طبقہ کا معاشی جرم بہ ظاہر کنز والون سے سخت معلوم ہوتا ہو، قرآن[1] مین اس موقع پر کنز والون کا
ذکر ہو سکتا ہو، ایک تاریخی واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہو، میرا مطلب یہ ہو کہ نزولِ قرآن کا جو عہد ہے اسکی
تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو، کہ دنیا کا یہ وہ زمانہ تھا، خصوصاً یورپ اور ہندوستان کا وہ عہد تھا جسمین
نام نہاد مذہبی پیشواؤن نے مختلف ترکیبون سے عوام کو اپنے قبضہ مین اس طرح کر لیا تھا کہ ان کی گرفت
سے وہ باہر نہین نکل سکتے تھے، یورپ مین تو "اعترافِ جرم" کا ایسا ہتھکنڈا تھا، کہ ہر عامی اپنے جرائم کا پادری

---

[1] یہان ایک مسئلہ پر تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے یعنی احبار و رہبان کا جو طبقہ جماعت کو تعلیماً یا تہذیباً، تدریساً یا تالیفاً،
وعظاً یا تذکیراً یا کسی اور ذریعہ سے واقعی نفع پہنچاتا ہے، اور اس کاروبار مین اپنا وقت خرچ کرتا ہو، ظاہر ہے کہ عوام سے
ان کو کچھ امداد ملتی ہو، تو یقیناً یہ "اکل اموال الناس بالباطل" نہین، خصوصاً قدرِ ضرورت سے زائد آمدنی اس راہ سے جو ملے
وہ "سبیل اللہ" مین جب خرچ کیجائے مثلاً اشاعتِ اسلام، تاسیس مدارس و مکاتب، نشر کتب وغیرہ مین خرچ کیجائے تو
چندہ بازی کے عارضے سے "فتوحات" کے اس سلسلہ کو مین مذہبی طبقہ کے لئے اب بھی بہتر سمجھتا ہون، کیا پیغمبر سے بھی بڑا
نمونہ کوئی اور ہو سکتا ہو، اس مین شک نہین کہ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گلہ بانی بھی کی تھی اور تجارت
بھی، لیکن سوال منصب نبوت پر سرفرازی کے بعد ہے؟ انسانون کی رکھوالی کے سوا کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ آدم کی اولاد
کا یہ سب سے بڑا راعی پھر کسی معاشی مشغلہ مین مشغول ہوا، خدیجہ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت ان کی وفات ہی کے

کے سامنے اقرار کرکے بظاہر خدا کی گرفت سے سمجھتا تھا کہ نجات مل گئی، لیکن درحقیقت وہ پادریون کی گرفت
مین آجاتا تھا،

پھر سلاطین کا کلیسا کے نیچے اس طرح دب جانا کہ پوپ کے فرمان کی خلاف ورزی ناممکن ہو چکی تھی، نیز
خدا کی رحمت کا عام بیوپار کلیسائی نظام مین عام طور سے جو جاری تھا، آٹھ آٹھ آنے اور دس دس آنے سیر
خدا کی رحمت کو پادری عام طور سے بیچ رہے تھے، آسمان پر وہی کھولا جاتا تھا، جسے زمین پر پادری نے کھولا ہو،
اسی قسم کی بیسیون ترکیبین تھین جن کے ذریعہ سے عوام کی کمائی پر کلیسا اور کلیسا کے نمایندون کا پورا اقتدار
قائم تھا، من مانے طور پر جس سے جس قدر جس وقت چاہتے تھے، عیسائی مذہب کے یہ احبار (علماء) اور رہبان
(مشائخ) وصول کر لیتے تھے، نتیجہ یہ تھا، کہ گرجون اور چرچون کے خزانے شاہی خزانون سے کہین زیادہ
وسیع ہو چکے تھے، معمولی معمولی گرجے مین لاکھون کی دولت بصورتِ کنز جمع رہتی تھی، تقریباً یہی حال
ہندوستان مین برہمنون، سادھوؤن، یوگیون، اور جوگیون نے پیدا کر رکھا تھا، محمود غزنوی کو "سومنات"
مین ہندو مذہب کے احبار اور رہبان کی کنز کی ہوئی تاریخی دولت ہاتھ آئی تھی، والقصۃ بطولہا تاریخ کے

(بقیہ حاشیہ ۲۰) بعد نہین ان کی زندگی ہی مین قریب قریب ختم ہو چکی تھی، طائف کے رئیس نے پیغمبر کی غربت ہی کو
انکارِ نبوت کی دلیل ٹھیرایا تھا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ جب آئے اور کچھ ہی دن کے بعد وہ سب آگئے جن کے مصارف
کا بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، حتی کہ آپکے مولیٰ زید اور آپ کی دائی کھلائی ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تو اس
وقت تک جب تک اسلامی فتوحات کا دروازہ نہین کھلا تھا، آخر خود پیغمبر، آپ کے اہل و عیال لوگ، لواحق وغیرہ کی
گذر بسر کا ذریعہ کیا تھا؟ سیرت نگارون نے اگر اس کا ذکر نہین کیا تھا، تو کیا بخاری کے متعدد مقامات مین یہ روایت
انس بن مالک خادم خاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موجود نہ تھی کہ کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم النخلات
حتی افتتح قریظۃ والنضیر (یعنی جبتک بنی قریظہ اور بنی نضیر کی جائداد قبضہ مین نہین آئی تھی، دستور تھا کہ لوگ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے "النخلات" یعنی کھجور کے درخت مختص کر دیتے تھے جس کے معنی یہی ہو کہ ہجرت کے چار پانچ سال تک مجاہد کی حیثیت

ان واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد دونون آیتون کی باہمی مناسبت کا کچھ سُراغ مل سکتا ہی، "ترک دنیا"
کو "حصول دنیا" کا آلہ بنا کر زندگی گذارنے والون کا زور اگرچہ اب بہت کچھ ٹوٹ چکا ہی، لیکن پھر بھی ہر ملت
و مذہب مین ایک طبقہ بے کاری سے روزگار حاصل کرنے والون کا تقریبًا دنیا کے اکثر خطون مین موجود ہے،
اور گو اب "الذہب والفضۃ" کی ریل پیل کا حال ان کے یہان اس طریقہ پر تو نہین ہے، جو کبھی تھا، تاہم ان کے
بعض سر برآوردون مین عہد ماضی کے کچھ نمونے اب بھی نظر آتے ہین، سب کمائین، خون کا پسینہ بنا کر کمائین،
اور ان کی کمائی سے محض قدیم روایات کی بنیاد پر کچھ لئے دیئے کرے دھرے بغیر یہ وصول کرتے رہین، اس
سے صرف یہی نہین کہ ان کی اکتسابی قوتین اپنے افادی اور معاشی نتائج کو ظاہر کئے بغیر مسلسل نسلاً بعد نسل
قبرون مین دفن ہوتی چلی جا رہی ہین، بلکہ بے کاری کے اس عجیب و غریب سستے اور آسان روزگار کو دیکھکر
کتنے دلون مین ان کی ریس کی ہوک اٹھتی ہی خدا ہی جانتا ہی، کہ اس ریس کے سلسلہ مین مکر و فریب خدع

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰) گویا مریدون کی تھی، وہی خدمت کی سعادت سے سرفراز ہوتے رہی، اور یون بھی متفرق روایتون
مین مختلف طریقہ سے انصار کی ان خدمات کا تذکرہ حدیثون مین آتا ہی، بلکہ صدقہ نہ لینا اور ہدیہ لینا، بعض صحابہ نے تو اسی
ذریعہ سے آپ کو پہچانا، سلمان فارسیؓ کا حال پڑھئے، شہدای احد مین مخیریقؓ نامی صحابی جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے، انکا
روض الانف مختلف کتابون مین لکھا ہی کہ انھون نے ایک نہین سات باغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیئے "اموالی
الی محمد یضعہا حیث یشاء" (یعنی میرے باغ آنحضرتؐ کے سپرد ہین، جو چاہین کرین، برقہ، دلال، صائفہ، حسنی، الاعراف، المثیب،
مشربہ ام ابراہیم ان باغون کے نام تھے، مخیریقؓ جب احد مین شہید ہو گئے تو جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین انصرف
مالہا وقفًا فادھنوا ذل حبس حُبس فی الاسلام (روض الانف ص ۱۴۳ ج ۲) یعنی حضورؐ نے ان باغون کو وقف فرما دیا،
اور اسلام کا یہ پہلا وقف تھا، آخری باغ مین ایک بنگلہ تھا، ماریہ قبطیہ ام المومنینؓ کا مسکن وہی تھا، اسی لئے ان کے نام
کی طرف منسوب ہوا، مطلب یہ ہے، کہ علماء اور مشائخ مین جن بزرگون کا نام "کا متی فی اللہ" ہو گیا، بقدر ضرورت اگر وہ فتوحات
کے لینے سے انکار نہین کرتے تھے، تو اسکی وجہ یہی ہی، ۱۲

اور دجل کے جالون مین غریب عوام کو آئے دن پھنس پھنسا کر اپنی بیوی اپنے بچون کے منہ سے نوالون کو چھین کر
ان کے شکم کی دوزخ کو بھرنے پر مجبور ہونا پڑا ہی، جو کچھ اس طبقہ کے ذریعہ سے ہو چکا اور ہو رہا ہے[۱]، چونکہ خدا
اور اس کے دین کے نام سے ہو رہا ہی، ان کو دیکھتے ہوئے سچ تو یہ ہی، کہ جن سزاؤن کا ذکر قرآن مین ہی، اگر
یہ آخرت مین ان کے مستحق ہون تو شاید ان کے حق مین یہ زیادتی نہ ہوگی، آخر کچھ تو مصلحت ہی، کہ احبار و رہبان
کی اکثریت جس اکل بالباطل کی مرتکب ہے، اس کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان سزاؤن کا حق تعالیٰ نے کیون
تذکرہ فرمایا ہے، شاید قرآن کے اسی طرز عمل کا ذکر ہے، کہ مسلمانون نے مذہبی خدمات انجام دینے والے
طبقون کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانون کی دینی خدمت مین اپنا زیادہ وقت اخلاص اور
دیانت و امانت سے صرف کرتا تھا، اور اس لئے جو امداد اسلامی حکومت یا عام مسلمانون سے ان کو ملتی
تو یہ "اکل بالباطل" (یعنی کچھ دیئے بغیر دوسرون کا مال کھانا) نہ ہوتا، لیکن قرآن کی ان دھمکیون سے غالبًا وہ
اتنا متاثر تھا، کہ اس امداد کا لینا بھی انھون نے پسند نہین فرمایا، اور اپنی معاشی ضرورتون کے لئے دوسرے
دھندے انھون نے اختیار کئے، اکبر کے دربار مین جب فقہاے اسلام پر تنقید شروع ہوئی تو مفت خور

[۱] مین نہین سمجھ سکا کہ یورپ کے موجودہ الحاد اور بے دینی کے سلسلہ مین مسکین سائنس اور غریب کیمیا کو کیون بدنام کیا
جا رہا ہے حالانکہ آج تک سمجھ مین نہ آیا، کہ سائنس کے کسی مسئلہ اور کیمیا کے کسی انکشاف کی مذہب پر بالواسطہ یا بلاواسطہ
فی نفسہ زد پڑتی ہے، مین تو یہی سمجھتا ہون کہ قرون وسطیٰ مین کلیسائی نظام کے تحت مذہب کے نام سے یورپ پر ظلم کا جو پہاڑ
توڑا گیا ہے، یہ اسی کا رد عمل ہے، یورپ والے چونکہ عمومًا انتہا پسند واقع ہوئے ہین جب مذہبی تھے، تو ان کو لوٹ کر مذہب
کے نمایندون نے احمق بنایا، اور جب لامذہبیت کا دور دورہ ہی تو پاجیون اور بدکردارون کی بن آئی ہی یا دوسرے لفظون مین
شیطان کی بن آئی ہی، وہ نچا رہا ہی، اور یہ ناچ رہے ہین، مشرقی ممالک مین نسلی گداگرون کا جو گروہ بتایا جاتا ہی یہ انہی اکل بالباطل
کھانے والون کی بیوقوف جاہل اولاد ہے، البتہ فریبی کیلئے جس زیرکی اور چالاکی کی ضرورت ہی، وہ ان مین نہ تھی، مگر خاندانی
طور پر "اکل بالباطل" کے عادی تھے، بھیک مانگنے کے سوا اور چارہ کار کیا تھا،

برہمنوں اور سادھوؤں کو جس دربار میں ہر قسم کے انعام واکرام کا مستحق سمجھا جاتا تھا، اسی دربار کا مشہور وزیر ابوالفضل اسلامی فقہار کے متعلق کہا کرتا تھا کہ "ہر جوتے گانٹھنے والے مٹھائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا" اشارہ اسلام کے ان علمار اور فقہار کی طرف تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہیں فرماتے تھے، بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائعِ معاش سے روزی حاصل کرتے تھے،

ابوالفضل کی نگاہ میں اُن کا یہی ہنر عیب بنکر چبھ رہا تھا، فیا للعجب !!

بہرحال احبار ورہبان کی اکثریت حالانکہ فسق کے مختلف گفتہ وناگفتہ بہ حالات اور عادات میں مبتلا تھی، لیکن سب کی طرف "وکثیر منہم فاسقون" کے اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہوئے صرف ان کے اس معاشی جرم یعنی "اکل اموال الناس بالباطل" کا کھلے کھلے صاف لفظوں میں قرآن نے جو اعلان کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام کی نگاہ میں معاشی لمحات اور معاشی مسائل کی کتنی اہمیت ہے، حالانکہ جہاں تک تاریخ کی شہادتیں ہیں، اس طبقہ کے جرائم کچھ کم ہولناک اور شرمناک نہ تھے،

(باقی)

کامیاب زندگی کا قرآنی تصوّر

از

ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

ع تقصیر مکن دانۂ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ کتنا بلند نصب العین ہے! زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے محبوب ہے! اس کے چہرۂ زیبا سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خط وخال نظر آئیں، اور ہم چیخ اٹھیں ؎

دستے کہ پیکرِ تو بدین آب وتاب ریخت — گرد رہت بر آئینۂ آفتاب ریخت!

(بیخود موہانی)

ورنہ بقول عرفی "خوابِ نادیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی!

کامیابی کا لفظ اپنا آپ مفسّر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشا، لعب ولہو ہی کو مقصودِ زندگی قرار دیں گے، لیکن جب یہ بچپن کی منزل سے گذر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زینت، آرایش وزیبایش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام لذّات کی سر بالاتر! التباس کا یہ زمانہ ہی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت وتفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے

لگتے ہین، جب ان کی عقلون مین پختگی پیدا ہونے لگتی ہے، تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہین، اور کہہ اٹھتے ہین

اے آنکہ تمام آرزو و ہوسی طفلی مستی مخبطی خود چہ کسی !! (رفیع واعظ)

اب زینت و آرایش سے زیادہ ٹھوس قیمتون کی طرف ان کی نگاہین اٹھنے لگتی ہین، وہ مال و دولت کے تکاثر، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہین، اور بچپن اور نوجوانی کی خام آرزوؤن کو خبط اور مستی سے تعبیر کرتے ہین، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی یہ قیمتین اب ان کا نصب العین ہوتی ہین، انہی کے حصول مین وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہین، سمجھتے ہین کہ بس ان کو پاکر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائین گے، طمانیت قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحت جان نصیب! اسی مغالطہ مین ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گذر جاتے ہین، رنج و راحت کی متعدد مقدار انھین ملتی ضرور ہے، لیکن امل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے :-

شد عمر تمام و ناتمامیم ہنوز در دوزخ حسرتیم و خامیم ہنوز

عمریست کہ در راہ طلب گام زنیم وین طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز (مومن یزدی)

پیری کی منزل مین قدم رکھکر انسان کی بصیرت مین عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے، اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی مین وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس کو سراب کو آب، خوب کو خراب عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہین کرتا، اب وہ اشیاء کی حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گوناگون تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل مین اس کے حافظہ مین محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لیکر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے، ہوش ربا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اسکی پرستش کرنے لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے،

یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہین کان لم تغن بالامس، !

احوال جہان و اصل این عمر کہ ہست خوابے و خیالے و فریبے و دمے ست (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملون مین یون ادا کیا ہے :

اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو (طفلی)	تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب
وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی (شباب)	اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا
الاموال والاولاد، کمثل غیث (شیخوخت)	اموال و اولاد مین ایک کا دوسرے سے اپنے
اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ	کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ ہے کہ اسکی پیداوار
مصفرا ثم یکون حطاما	کاشتکارون کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ
(پ ۲۷ ع ۱۹)	خشک ہو جاتی ہے، تو اسکو زرد دیکھتا ہے پھر وہ
	چورا چورا ہو جاتی ہے،

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

بہتون کے لئے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثر اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان مین اسکی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا، کہ اہل دنیا برترین اقدار، یا تو لذت کو قرار دیتے ہین، یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اقدار کے تحقق مین کامیاب ہوتی ہے، ہمین ذرا سنجیدگی سے یہان زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے، ع :-

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

کیا لذت مقصود زندگی ہو سکتی ہے ؟ کیا ہم لذت اندوزی، اور دل خوشی کے لئے پیدا ہوئے ہین، کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے مسٹر وڈورس کا خیال تھا، کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے

ہوتا ہے[1] اور فرائیڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلۂ تناسل ہی، سامرنی مذہب کا بانی ارس تبوس لذت ہی کو مقصود حیات قرار دیتا ہے، اپنے پیرودن کو اسکی تلقین تھی ؎

ہر چو منت اعتقاد باید کردن | مے خوردن و اندوہ جہان ناخوردن! (خیام)

ابیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اوّلین محرک جلب لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلّم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے ابیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد والم سے اور روح کا پریشانی وغم سے نجات دلانا اس کے پیش نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام و افکار سے نجات ہو، دوستی و محبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تفنّنات ابیکورس کے خیال میں، خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ؎

تنگے مے لعل خواہم و دیوانے | سد رمقے باید و نصف نانے
وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے | خوشتر بود از مملکت سلطانے!

خود خیام نے جہان بیوفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحب نظر جب عالم پر غور کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ؎

در عالم خاک از کران تا بکران | چندانکہ نظر کنند صاحب نظران
حاصل ز جہان بے وفا چیزے نیست | الا مے لعل و عارض خوش پسران

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت" قبر کے گوشے میں سونا ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے گو ایک راز نہفتہ ہے کہ ع

ہر لالہ کہ پژمردہ نخواہد بشگفت!

---

[1] اور انسان کی حالت مکھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفتہ ہوتی ہے ؎

ہر جا کہ مگس پرد چہ بالا و چہ پست | جز شیفتۂ در بودۂ حلوا نیست (سحابی استرآبادی)

تو پھر جلب لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ الذتیت کے اسی بنیادی اصول کو خیام قوت کیساتھ پیش کرتا ہے ؎

کم خور غم روزگار ناساز شدہ (دفع الم) | مے خور ز کف ساقی دمساز شدہ (جلب لذت ۱۲)
کان کز کشش باد در آمد امروز برون | فردا بینی بگون زن باز شدہ!

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفاظ کوئی استعمال کرے اس کا مدلول و مفہوم ہوگا وہی جو جلب لذت و دفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد و غم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت و خوشی کا طلبگار ہے، اشیاء کا اچھا یا برا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رسان ہوتا ہے، وہ الم رسان تکلیف دہ شے کو بری سمجھتا ہے اور لذت بخش اور فائدہ رسان چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے، یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کرکے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈنی چاہئے، لذت ہی کو اپنا مقصود حیات قرار دینا چاہئے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں،

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے، کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے؟ لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہئے، لذت ہی کو اپنی غایت قصویٰ قرار دینی چاہئے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ

جہان از پئے شادی و دلخوشی است | نہ از بہر بیداد و محنت کشی است؟

یا سچی بات در اصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پئے دلخوشی | مگر کز پئے رنج و محنت کشی!؟

فتکفرُوا ولا تکونوا من المستعجلین!

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور و فکر سے خود ظاہر ہو جائے گا، دیکھو بات یہ ہو کہ ہماری خواہشات کا مبدء، در اصل ہماری احتیاجات ہین، اشتہاآت ہین، ہماری خالص انسانی اغراض ہین، جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہذا کم از کم بعض مثالون مین تم کو یہ ماننا ہی پڑے گا، کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل مین وہ اشیاء ہین جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے نہ کہ مجرد لذت، دیکھو ہمین پہلے بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی اول احتیاج، پھر اسکی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتون کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس مین شک نہین کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہین، تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہین، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر کھانے لگین، اور اس طرح دانتون سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر کھودنے لگین! اس سے یہ صاف ظاہر ہے، کہ ہر حالت مین ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہین ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اوس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈلے کے الفاظ مین نام ہے تحقق ذات یا تکمیل نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہاآت کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات مین بدن و ذہن یا روح دونون کی ضروریات شامل ہین، ان ہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہذا خواہش براہ راست لذت سے متعلق نہین ہوتی، لذت براہ راست معروض خواہش نہین، اور نہ بذات خود ہمارے لئے قیمت رکھتی ہے، ہان اس کو "مقیاس قیمت" قرار دیا جا سکتا ہو، بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرمامیٹر کا درجۂ حرارت خود حرارت نہین ہوتا، بلکہ مقیاس الحرارت ہوتا ہو، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے، لیکن خود کبھی مقصود بالذات

نہین ہوتی، اس لئے لذتیہ کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہو نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا،

اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمھاری سمجھ مین نہین آرہی ہو، تو خود تجربہ کرکے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو، بہت جلد تم کو معلوم ہونے لگے گا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے! یہ عجیب بات ہو اور ہر تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے، (فلاسفہ اس کو "استبعاد لذتیت" کے نام سے موسوم کرتے ہین) کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بچ نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو، اتنی ہی کم وہ ملتی ہے، اور جس قدر بے پرواہ اسکی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر وہ تمھارے پیچھے دوڑتی ہے! پروفیسر ڈیوے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہین

"جب جذبہ کا رجحان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان یا تو کلبیت اختیار کر لیتا ہے، اور سرد ذوقی مین مبتلا ہو جاتا ہو، یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش مین رہتا ہو، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی پژمردہ اور درماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس مین نئے سرے سے جان ڈالے! اگر کوئی شخص محض حسی زندگی بسر کرکے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہو، اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پائے جاتے ہین، تو اوس کی قوت احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہو، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہو"[1]

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیہ اور اتباعِ ایپکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لئے ناممکن ہو، انکی لذتیت مین قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی، اب وہ بجائے حصولِ لذت کو دفع الم کو مقصد حیات قرار دینے لگے، ایپکورس کا یہ قول مشہور ہے:-

[1] نفسیات ص ۲۹۹،

"جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شُربِ مدام ہے اور نہ صنفِ نازک کی صحبت اور نہ مرغ و ماہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کئے ہوئے دسترخوان بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے اور ان بیہودہ خیالات و اوہام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں"[1]

سچ ہے:

اصلاحِ مزاج از ضروریات است
یک تنقیۂ دماغ می باید کرد! (واقف)

ارس تی پوس کا مشہور پیرو ہگے سی یس (Hegasius) لذت کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اوس کو سکھلاتا ہے، کہ باغِ جہان میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ دردست و دوا می خواہد	از خوانِ کرم برگ و نوا می خواہد!
کس بے حاجت نمی تواند دیدن	درویش غذا شہ اشتہا می خواہد!

(سحابی استرآبادی)

جب لذت مقصودِ حیات اور وہ ناقابلِ حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوانِ بے مغز ہے، عاقل اس استخوان کو کتون کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحتِ جان پاتا ہے، موت ہی سے سارے درد و الم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم و وہم دور! ایجابی لذت ناقابلِ حصول لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ۔ لہذا

[1] دیکھو بیک ول کی کتاب (SOURGE BOOK OF ANCIENT PHILOSOPHY) ص ۲۰۰ مقابلہ کرو امام کی کتاب فلسفہ یا نیس ص؛

با چرخِ ستیزہ کار مستیز و برو	با گردشِ دہر در میامیز و برو!
یک کاسۂ زہر است کہ مرگش خوانند	خوش درکش و جرعہ بر جہان ریز و برو!

(امیر ابو اسحٰق)

یہ تھا استدلال ہگے سی یس کا، اور اس قوت و اثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگون نے خودکشی شروع کردی اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا!! آج جو لوگ زندگی کا مقصدِ وحید لذت اندوزی اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انھیں اسی طرح استدلال کرنا پڑے گا، لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستون کا تجربہ یہ ہے تو بتاؤ کہ ع

با تجربہ مستورۂ لذت چہ کند کس؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیون کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایتِ قصوی قرار دینا چاہئے، درست نہیں تو کیا ہے؟

نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیباتِ حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا، اس کو موجِ سراب اور جوشِ حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔ ع

انّ اللبیب بمثلھا لا یخدع

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرمِ عمل ہوتا ہے، اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہے، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اسکو آرامِ جان اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ رومؔ کیساتھ شامل ہو کر وہ لذتیہ سے کہتا ہے

گر گریزی بہ امید راحتے	ہم ازانجا پیشت آید آفتے،
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست	جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست!

جب لذت مقصودِ زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہارِ خلق، جاہ و مرتبت نام و نمود وہ اعلیٰ اقدار ہین
جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جا سکتا ہے!؟ ہم مین سے بہت سارے ایسے ہین، جنھیں زبان کی لذت
سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لئے اپنی تمام کثیف لذتون کو قربان
کرنے پر تیار ہو جاتے ہین، مصائب مین گرفتار ہونے سے نہین گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ
ہو جاتے ہین، آفتون اور خطرون کا مقابلہ کرتے ہین، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت
ہے، تو بھی ان کی ہمت پست نہین ہوتی، !ان کے لئے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہے، مطلق
قیمت جو اضافی قیمت نہین !

شہرت کی خواہش ہر انسان مین کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس
تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعاً پسند! بندہ ہونا اس کے نفس پر شاق ہوتا ہے خدا بننا بہت
جلد محبوب ہے، ہر شخص کے باطن مین وہ جذبہ موجود ہے، جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے
کی تھی، انا ربکم الاعلیٰ، اسکی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہین، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقول عارف
روم فربہ ہوتا ہے:

جانور فربہ شود از راہ نوش
آدمی فربہ شود از راہ گوش

شہرت کا طالب در اصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے
نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے، اور اسکو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت کو ادا کرنے
پر تیار ہوتا ہے،

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردقلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے ہوا پر! تعریف جو خلق
کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا خفیف سا جھونکا بھی ہمارے بہار شہرت دل

کے غنچہ کو شگفتہ کر دیتا ہے! مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادون پر قائم کریگا؟
کیا ہوا پر اس کا اختیار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رُخ کس طرف ہو گا؟ عوام کالانعام آج اپنے
ہیرو کو اوجِ آسمان پر جگہ دیتے ہین، اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ ذلت پر پٹک دیتے ہین، آج تحسین
تصفیق ہے، اور کل زجر و توبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی! یہ ہے المناک تجربہ تقریباً ان
تمام پرستارانِ شہرت کا جنھیں عوام نے کچھ دن کے لئے بُت بنا کر پوجا تھا، ولنگٹن واٹرلو کا فاتحِ اعظم نپولین
کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سر
آنکھون پر بٹھاتے ہین، بطلِ اعظم کا خطاب دیتے ہین، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیون مین یہی
مشتعل و غضب آلود مجمع پتھرون سے اسکے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے، جس کو ولنگٹن اپنی موت کے دن
تک محفوظ رکھتا ہے! جولیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے، اور دوسرے دن احسان فراموش
دوستون کے ہاتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، اسکندرِ اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن
پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو بھی کوئی نہین ملتا!! یہ ہے انجام ہر شہرت
و رفعت کا !

گیرم پسرا کہ رستم و سام شدی — یا خسرو نیمروز یا شام شدی
نہ زور بگور می توان برد نہ زر — افسوس کہ مبتلائے اوہام شدی!

(نصرت اللہ خان نثار)

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ کہ انسان اپنی
ہی ذات کو کبیر اور سارے عالم کو اپنے مقابلہ مین حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعوی کرتا ہے،
بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت کے گھمنڈ مین حدود اللہ
سے تجاوز کرتا ہے: وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (ب ۲ ع ۹) جس شخص کا دماغ اس قدر

الٹ جائے اس کو مسرت و طمانیت قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے، ؟ اس کو ہر قدم پر خلافِ طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے، اور کوئی حسد، کوئی اس کو "قطرۂ آب گندہ" کہتا ہے اور کوئی "طرفہ جانور" اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے نہیں بچ سکتی، شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہے، اور بقول عارفِ رومؔ اسکی حالت یہ ہوتی ہے،

خشمہا و چشمہا و اشکہا بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے! اسکی اصل وجہ یہ ہے، کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور خلق سے سوائے غم واندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، ! وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے، ان پر اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے، اور سمجھتا ہو کہ اساس پائدار اور مستقل ہے، فیا للعجب! خلق کے وعدوں سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں، ہے

وعدۂ اربابِ دنیا ہمچو خوابِ احتلام شب ہمہ شب عیش و عشرت باشد و فردا دروغ!

(کلیم)

ایسے احمق پر ترس آتا ہو، مگر اس کے مقصودِ حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا!

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے، ! اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر خالص لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہو، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پاسکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہو، حق تعالی کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر

نہیں آتی، حق کی طرف سے اسکی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دیدِ حق نہ رہے، تو پھر اس میں پوست کے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دیدست و باقی پوست ست

دید آں باشد کہ دیدِ دوست ست! (رومی)

سَاَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ، (پ ۹ ع ۷)

میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی رکھونگا، جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں،

اسی کی طرف اشارہ ہو، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالی کا مبغوض ہو جاتا ہو، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ! جب دیدِ حق کھو چکا، حق تعالی کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا!؛ انانیت، اپنی ذات سے محبت، اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزاء اسکی ہلاکت اور بربادی کے! اسی لئے نفسِ انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

اِنَّمَا يَهْلِكُ النَّاسُ بِاتِّبَاعِ الْهَوٰى وَحُبِّ الثَّنَاءِ،

ہوی و ہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہو،

ایک اور طریقہ سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہو،

ذئبان ضاریان ارسلا فی زریبۃ غنم لیسا باکثر فسادا من حب الشرف والمال فی دین الرجل، (المسلم)

دو بھیڑیے حملہ کرنے والے جو بھیڑوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جائیں اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے دین میں کرتی ہے،

اسی حب الشرف سے ارادۂ رفعت یا ارادۂ علو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے خالی نہین ہوتا، اپنی آخرت درست نہین کرسکتا،

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (پ ۲۰ ع ۱۲)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگون کے لئے خاص کرتے ہین، جو دنیا مین نہ بڑا بننا چاہتے ہین اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگون کو ملتا ہے،

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبد العزیز اس آیت کو مرتے وقت پڑھتے تھے، یہان تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہین منع کر رہے ہین، ہم علم مین منفرد بالکمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہین، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہین، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہین، اور ہمارے عقیدہ کی رو سے یہ علم، یہ معرفت عارفین کے لئے مرنے کے بعد نور بنے گی،[۱]

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا (پ ۲۸ ع ۲۰)

ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا، یون دعا کرتے ہون گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے لئے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھ،

اور جو اس نورِ معرفت سے بے بہرہ ہون گے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریون مین پڑا ہے،

كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا (پ ۸ ع ۲)

اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ "تاریکیون مین ہو، ان سے نکلنے ہی نہین پاتا"

ہم اس جذبہ کی مذمت کر رہے ہین جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی ذات کو

۱ دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۲۵،

کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لئے حاصل کرنا چاہتا ہے، کہ لوگون کے دلون اور جسمون پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص مین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی صورت مین سیدھے راستے کی تعلیم فرمادی تھی،

اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي صَبُورًا وَشَكُورًا وَاجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا[۱]

حق تعالیٰ مجھے صابر و شاکر بنا، مجھے اپنی آنکھون مین صغیر رکھ، اور لوگون کی آنکھون مین کبیر بنا،

جب مین خود اپنی آنکھون مین حقیر ہون، اپنی بندگی و بے چارگی کو بھول نہ جاؤن، اپنی قلت و جہل سے باخبر ہون تو پھر مجھ مین نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہین، اور حقیقی کمال سے حصۂ وافر، یہ بزرگی اور کمال ان کا عطیہ ہے، اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہو!

مقصود حیات اگر شہرت یا استعمارِ خلق نہین تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس امر مین شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہین ہوگا، کہ مال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے حصول کا، خود غایت نہین، ہم نے ان غایات مین سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو زندگی کا مقصود نہین قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے ابطال سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئے گا، اور اگر جائز مقصد حیات کے حصول مین یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے، اور عظیم الشان نعمت ہے[۲]

مال را گر بہر دین باشی حمول
نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسول!

۱ یہ دعا حضرت بریدہؓ کی روایت سے مسند بزاز مین ملتی ہے،

اب ہمین زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہئے،

قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی مین مقصود حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جہان کی تخلیق کی غایت ہی، صریح ارشاد ہے:

مَاخَلَقْتُ الجِنَّ وَالاِنسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ[1]

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہین، لہٰذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہین، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا:

یَاقَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ	اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے
(پ ۱۲ ع ۵)	سوا تمھارا کوئی معبود و رب نہین"

جامی نے اس مقصود کو ان دلپذیر اشعار مین ادا کیا ہی؛

از زندگیم بندگیِ تست ہوس	بر زندہ دلان بے تو حرام است نفس!
خواہد ز تو مقصودِ دلِ خود ہر کس	جامی ز تو ہمین ترا می خواہد و بس!

زندگی کا مقصود برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہین، ان کی یافت ہے، ان کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہے، یا یون کہو کہ ہماری ساری عبادت، ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے!

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ	کہو کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا
لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ	جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہی جو
بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ	مالک ہی سارے جہان کا، اُس کا کوئی شریک نہین اور
(پ ۸ ع ۱)	مجھکو اسی کا حکم ہوا ہی اور مین سب ماننے والون سے [illegible] (تھانوی)

---

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے کی ہی، ۱۲

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہین، اسی لئے ہمارے محبوب و مطلوب بھی،

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ،	اور جو مومن ہین ان کو اللہ کے ساتھ نہایت
(پ ۲ ع ۴)	قوی محبت ہے،

وہ ہماری جان و مال، فرزند و زن سے زیادہ عزیز و محبوب ہین،

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم	خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصودِ منِ خستہ ز کونین توی	از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہین، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح بسر کرنے کا حکم دے رہے ہین، پہلے اجمال پھر تفصیل:

اجمالاً یون سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہین اور محبوب ہین تو ہمارا ہر کام ایسا ہونا چاہئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت مین شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثالِ امر مین ہو، ان ہی کی رضامندی و خوشنودی کے خاطر ہو، نفس و ہویٰ کی پیروی مین نہ ہو، یعنی لذت اندوزی کے لئے نہ ہو، عیش پرستی کے لئے نہ ہو، جاہ طلبی کے لئے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امرِ حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح مین تقویٰ کی زندگی ہی، اور یہی کامیاب زندگی ہے، اقبال کے تمہیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ مین تقویٰ کی زندگی اور کامیاب زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہین،

وائے ما اے وائے این دیرِ کہن	تیغ لا در کف نہ تو داری و نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جوان	این جہانِ کہنہ در باز اے جوان
تا کجا بے غیرتِ دین زیستن	اے مسلمان مردن است این زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را	جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

برعیار مصطفیٰ خود را زند،

تا جہانے دیگرے پیدا کند

اب ذرا تفصیل مین جاکر تقوی کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو،

قرآن مین متقیون کی تعریف اجمالاً یون کی گئی ہے :

والذی جآء بالصدق وصدق
به اولٓئك هم المتقون، (پ ۲۴ ع ۱)

جو سچی بات لے کر آیا، اور جس نے اوس کو
سچ مانا، وہی لوگ پرہیزگار یا متقی ہین،

جو سچی بات لیکر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقوی نبی کو سچ ماننا اور اسکی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہین، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہین، اپنی طرف سے اس مین کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہین اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہین، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہین او ہی متقی کہلاتے ہین،

تقوی کی کچھ تفصیلات کو اس آیت مین پیش کیا گیا ہے،

لیس البر ان تولوا وجوهكم قبل
المشرق والمغرب ولكن البر من
آمن بالله واليوم الآخر والملٓئكة
والكتاب والنبيين واتى المال على
حبه ذوى القربى واليتامى والمساكين
وابن السبيل والسائلين وفى الرقاب
واقام الصلوة واتى الزكوة و
الموفون بعهدهم اذا عاهدوا

کچھ سارا کمال اسی مین نہین کہ تم اپنا منہ مشرق
کو کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی
شخص اللہ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر
اور فرشتون پر اور کتب پر اور پیغمبرون پر،
اور مال دیتا ہو، اللہ کی محبت مین رشتہ دارون
کو اور یتیمون کو اور محتاجون کو، اور مسافرون
کو اور سوال کرنے والون کو، اور گردن چھڑانے
مین، اور نماز کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ

والصابرين فى البأسآء والضرآء
وحين البأس، اولٓئك الذين صدقوا
واولٓئك هم المتقون ٥

(پ ۲ ع ۶)

بھی ادا کرتا ہو، اور جو اشخاص اپنے عہدون
کو پورا کرنے والے ہون جب عہد کرین، اور وہ
لوگ مستقل رہنے والے ہون تنگدستی مین اور
بیماری مین اور قتال مین یہ لوگ ہین جو سچے
ہین اور یہی لوگ ہین جو متقی ہین،

(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقوی کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد مین اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کتب منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقوی کے اساس ہین، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمال صالح ہین یہ ہونے چاہئیں، جن کی تفصیل بیان کی گئی، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے، انکی تین قسمین کی گئی ہین، انفاق: اقامت صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ، انفاق رشتہ دارون، یتیمون، محتاجون، مسافرون، سوال کرنے والون کے لئے ہو، اور قیدیون کے چھڑانے مین کیا جائے، انفاق کی شرط مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت ہی مین خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لئے نہین کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگون کی نگاہون مین برتری حاصل ہو، اخلاق مین ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کیساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی مین، بیماری مین اور کفار کے ساتھ جنگ مین،

تقوی کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیش نظر رکھکر حضرت امام غزالیؒ اسکی جامع و مانع تعریف یون کرتے ہین، کہ تقوی بچنا ہے ہر اس شے سے جس سے دین مین ضرر کا خوف ہو" محاورہ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے، اس کو عرب "متقی" کہتے ہین، اسلئے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے،[5] اسی طرح دین کا تقوی نواہی سے اجتناب ہے، حضرت

[5] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ نولکشور)

قرآن کی اس تعریف مین امتثالِ مامور یا عبادت پر زور نہین دیا جارہا ہے، بلکہ صرف اجتناب محظور یا گناہون سے پرہیز ہی کی تاکید کیجارہی ہے، منہاج العابدین مین وہ کسی جگہ فرماتے ہین، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہین، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہون اور شبہات سے پرہیز انسان کے لئے پہلے آدھے حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، مبتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور دیتے ہین اور کامل اہل بصیرت پرہیز کا حصہ اختیار کرتے ہین، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے، کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائین، لیکن اگر دونون حصے حاصل ہوجائین یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے، [1]

عبادت کے دونون حصون کا خیال رکھ کر تقوی کی جامع و مانع تعریف اس طرح کیجا سکتی ہے،

تقوی کفر و شرک نفاق و بدعت [2] سے احتراز ہے، امتثال مامور، اجتناب محظور اور رضا بمقدور ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اوامر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضائے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی رح اس طرح ادا فرماتے ہین [3] لَابُدَّ لِکُلِّ مومن فی سَائِرِ احوالہ مِنْ ثَلٰثۃِ اشیاء: امرٌ یمتثلہ ونھی یجتنبہ

[1] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص۱۱۱ و ص۱۱۹ [2] احتراز کا ذریعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان ماننا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہوجاتا ہے اور توحید داخل ہوجاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہونچایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہوجاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے، اسکی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے، بدعت دین مین کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہین، اس کو دین سمجھنا ہے، غرض شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان، نفاق کے جانے سے صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے، (دیکھو قرآن کا فلسفہ مذہب) [3] فتوح الغیب مقالہ اول،

وَتقدیرٌ یرضٰی بہ، یعنی ہر مومن کے لئے تمام احوال مین تین چیزین ضروری ہین، امر الٰہی بجالائے نہی سے اجتناب کرے اور تقدیر پر راضی رہے، اتنی بات یہان سمجھ لینا ضروری ہے، کہ امر الٰہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریعی، یہان وظیفہ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجالائے، اور امر منفی کی صورت مین ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہان بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، "رضا بالقضا" کا اشارہ اسی طرف ہے، بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہین، وہ کرے، اور جس طرح وہ رکھین، اس طرح رہے، اول عبادت ہے، اور ثانی "عبودیت"، ایسی ہی زندگی تقوی کی زندگی ہے، اور ہر معنی مین کامیاب زندگی!

اب دیکھو زندگی مین کامیابی و سرخروئی کے لئے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو نہین، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیر مطلق اور قدوس، منبع زندگی اور کائنات کا مبدء، وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہین، تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کیساتھ تعاون عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہین ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات مین توافق پیدا ہوجاتا ہے، اسکو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے،

عارف رومی نے کہا تھا، انما التدبیر تبدیل المزاج [1] آدمی مین سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے، [2] مومن کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر تم نے اوپر دیکھا، کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و ودود و علیم مطلق ذات کی تجلیات کا مظہر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی مین کامیاب ہوئے بغیر نہین رہ سکتا، اپنے مزاج کی اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چارسوے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہین، اقبال کے اس گان

[1] تدبیر اس کے سوا کچھ اور نہین کہ مزاج ہی بدل جائے۔

[2] یہ جی کے جسٹرٹن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گذرا ہے،

کو صحیح کر دکھاتا ہے ؎

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں کہ یہ چار سو بدل جائے!

خالق کائنات و رب کائنات سے حسن ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات ہی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے، اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں، رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا قول سچا ہوتا ہے، صادق مصدوق نے بھی تو اسکی خبر دی تھی ان للہ رجالا یرضی برضائھم و یغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ و یغضبوا بغضبہ بعض رجال اللہ ایسے بھی ہیں جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے بھی غضب فرماتے ہیں جس طرح کہ خود یہ مردان حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اوس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش ہوتے ہیں متقی کی اسی شان کو دیکھکر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے، ؎

فارغ بنشین و غم مخور و شاد بزی — این معنی لا الٰہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالی فرماتے ہیں کہ "جس نے تقویٰ اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہوگئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے بات اصل تھی سو حاصل ہوگئی" اپنی تائید میں وہ قتادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ "اے فرزند آدم تقویٰ اختیار کر اور جدھر چاہ سو رہ!" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں رہتا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، وہ بالفاظ غوث اعظم "ساکن الجوارح مطمئن الجنان، مشروح الصدر، منور الوجہ، عامر الباطن، غنی عن الاشیاء بمالکھا"[1] ہوتا ہے، لوگ اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالشئی

[1] ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء) اور قلب مطمئن اور فراخ و کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (فتوح الغیب مقالہ ۶)

ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے، وہ خود خالق اشیاء کو رکھتا ہے، اس لئے وہ غنی عن الشئی ہوتا ہے، اس کے ذل و افتقار کی نسبت حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لا الٰہ الا اللہ کی شمشیر ہے، اسی لئے وہ فرمانروائے موجودات[1] بنے، اس فقیری ہی کی وجہ سے اسکو امانت ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی ہے، اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لئے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
(اقبال)

تم دنیوی نقطۂ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان و زمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان و تقویٰ پر منحصر ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، (پ۹) — اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہوتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے،

ان برکات کیساتھ پھر نہ رنج و تعب ہوگا، نہ حزن و خوف،

فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، (پ۸ ع۱۱) — پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے تو ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ حزن،

کامیاب زندگی وہی ہے نہ جسمیں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہو؟ بشرط تقویٰ اس کا وعدہ کیا جا رہا ہے،

اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا، (پ۴ ع۳) — یعنی اگر تم استقلال اور تقویٰ کئے رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی،

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب و منصور ہوتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ، (پ۱۴ ع۲۲) — اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں،

[1] ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست — جملہ موجودات را فرماں رواست
(اقبال)

کامیاب زندگی وہی ہے جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزق حلال ہو: دیکھو اسی کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے:

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ، متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکالدیتے ہیں اور اسکو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ ۲۸ ع ۱۰) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں:۔ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا (پ ۲۸ ع ۱۰)

اخروی نقطۂ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ، ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ، — حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں

ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ، (پ ۲۶ ع ۱۴) — اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو،

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوتے ہیں،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (پ ۲۲ ع ۷) — اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردیگا،

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے

وَیُنَجِّی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِھِمْ لَا یَمَسُّھُمُ السُّوْٓءُ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، (پ ۲۴ ع ۳) — اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے ساتھ نجات دیں گے، ان کو نہ تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے،

ان ہی کے لئے بالآخر جنت ہے اور سامانِ عیش وعشرت،

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ، ..... الآیہ (پ ۲۷ ع ۳) — متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامانِ عیش میں ہوں گے،

بہرحال مومن متقی کے لئے دونوں جہان کی خوشخبری ہے، دنیا کی خوشخبری، آرام وآسائش اور برکتیں، غم وخوف وحزن سے نجات، دشمنوں سے حفاظت، اور حق تعالیٰ کی معیت ونصرت اور آخرت کی بشارت، معاملۂ قبر، حساب وکتاب کا آسان ہونا، یعنی حبس وحساب قیامت سے رستگاری اور بخششِ خداوند غفار وستار پھر روح وریحان وجنات نعیم[1]!

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ، لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (پ ۱۱ ع ۱۱) — یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے،

دیکھو یہی راز ہے جس کو پالینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائیگا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیرخواہ سب اگلے پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ، ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ؟ وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے:۔ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ ط (پ ۵ ع ۱۷) "واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو"

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور "یہ خصلت دنیا وآخرت دونوں کی جامع ہے اور سب

[1] راحت اور رغذائیں ہیں اور آرام کی جنت، (سورۂ واقعہ)

کاموں کے لئے کافی!"

مومن جانتا ہی کہ ع "عقل کو تنقید سے فرصت نہیں"۔ اسی لئے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہی، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ، حق تعالیٰ کی تقوی سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے، ان کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہ نفاق، انکی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لئے گو

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ ۔۔۔ نادان ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہی تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ۔۔۔ ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی ۔۔۔ اس دور میں ہی شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہی جس کا نام وہ ہی اک جنونِ خام ۔۔۔ ہی جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور ۔۔۔ مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش" (اقبال)

آئیے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں،

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر ۔۔۔ شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں ۔۔۔ مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

تفسیر ابو مسلم اصفہانی

عربی معتزلی کی مفقود الخبر نادرالوجود عقلی تفسیر قرآن کے اجزا جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کئے گئے ہیں، عمدہ ٹائپ میں چھپی ہی، قیمت عہ ضخامت ۱۰۳ صفحے، "منیجر"

اشتراکیت اور اسلام

از

جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے، حیدرآباد (دکن)

اشتراکیت کیا ہے؟ موجودہ زمانہ میں اشتراکیت کی اصطلاح اس تحریک کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جو ذاتی اور انفرادی ملکیت کو مٹا کر پیدایش دولت کے جملہ آلات و وسائل کو مملکت یا اسٹیٹ کے سپرد کر دینا چاہتی ہے، یہ تحریک موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا قدرتی ردعمل ہے جس میں افراد کی معاشی سرگرمیوں کو تمام اخلاقی اور معاشرتی قیود سے آزاد کر دیا گیا ہے، اشتراکیت سرمایہ داروں اور ان کے قائم کئے ہوئے معاشی نظام کی سخت دشمن ہے، اور دنیا کی تمام معاشی برائیوں، سیاسی جھگڑوں اور اخلاقی خرابیوں کی ذمہ داری سرمایہ داری کے سر رکھتی ہے، سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپ کے معاشی نظام میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا جسے صنعتی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس انقلاب کے بعد صنعتی پیداوار کے طریقوں میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں، چھوٹے پیمانہ کی صنعتیں، رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں اور بڑے پیمانہ پر پیدایش (Large Scale Production) کا طریقہ عام ہو گیا، بڑے پیمانہ پر صنعتوں کے قیام کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صنعتیں صرف وہی لوگ چلا سکتے تھے جن کے پاس کافی دولت تھی، اس کے علاوہ چونکہ آلات اور مشینوں کی خریداری بھی متوسط درجہ کے افراد کے لئے دشوار تھی اس لئے رفتہ رفتہ معاشی نظام پر ان ہی لوگوں کا قبضہ ہو گیا، جو متمول طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، پہلے مزدور وغیرہ اپنے آلات اور اوزار خود خریدتے

تھے اور یہ آلات ان ہی کی ملک ہوتے تھے، لیکن اب آلات اور مشینیں اتنی پیچیدہ اور گراں
ہوگئیں کہ مزدوروں کے لئے ان کا خریدنا بالکل غیر ممکن ہوگیا، اس طرح پیدائشِ دولت کے تمام
آلات و وسائل سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں آگئے اور مزدور کے پاس اس کے جسم و جان کے سوا
کچھ نہ رہا، سرمایہ دار جس قیمت پر چاہتے مزدوروں کی محنت خرید لیتے تھے کیونکہ مزدور نہ اپنے پیشہ
کے آلات و اوزار رکھتا تھا، نہ اس کے پاس کوئی خانگی جائداد یا سرمایہ تھا جس سے وہ خود کوئی کاروبار
کرسکتا، سرمایہ داروں نے اس طرح جو معاشی نظام قائم کیا، اس میں ذاتی ملکیت کا حق اور بے قید
مقابلہ کی آزادی یہ دو بڑے اصول کام کر رہے تھے، اس نظام کے حامیوں کا نظریہ یہ تھا کہ سوسائٹی
کے ہر فرد کو اس کا حق حاصل رہنا چاہئے کہ وہ جتنی دولت چاہے کمائے اور جتنی ملکیت چاہے
حاصل کرے اور اس حق پر کوئی قید یا پابندی نہ ہونی چاہئے، موجودہ زمانہ میں حکومتوں نے جس قدر
پابندیاں اور شرائط دولت کے جمع کرنے اور جائداد کے حصول پر عائد کئے ہیں وہ سرمایہ داروں
کے نزدیک ایک ناگزیر برائی کا درجہ رکھتے ہیں جسے بدرجۂ مجبوری قبول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ
سرمایہ داری کے حامیوں کا خیال ہے کہ انسان کبھی کوئی کام پورے جوش و انہماک اور سرگرمی
سے نہیں کرسکتا ہے، جب تک اُسے ذاتی فائدہ اور نفع کی توقع نہ ہو اور یہ اطمینان نہ ہو کہ اپنی
محنت سے جو دولت وہ پیدا کرے گا وہ اسی کی مِلک ہوگی اور اس کے صرف کرنے میں اس
پر کوئی قید عائد نہ کی جائے گی، تجارت اور صنعت و حرفت میں یہ نظام مقابلہ اور مسابقت
(Competition) کے فوائد کا قائل ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر دولت کی پیدائش
میں بہترین نتائج حاصل کرنا مقصود ہے تو ہر فرد کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنا
معاشی کاروبار انجام دے، اس طرح افراد میں باہم دگر مقابلہ کی اسپرٹ پیدا ہوگی، اور ہر شخص نفع
حاصل کرنے کی غرض سے اپنی پوری اہلیت اور کارکردگی کو کام میں لائے گا، کیونکہ اُسے خوف

رہیگا کہ اگر ذرا بھی اس سے سستی یا غفلت ہوئی تو دوسرے لوگ اس سے بازی لے جائیں گے،
سرمایہ داری معاشی کاروبار میں حکومت کی مداخلت ناپسند کرتی ہے، اور تجارت اور صنعت
و حرفت میں ہر طرح کے قیود سے آزاد رہنا چاہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی امور میں بھی
انفرادی آزادی کی حامی ہے، کیونکہ انفرادی آزادی کا حق وہ ہتھیار ہے جس سے سرمایہ دار
طبقہ معاشی نظام کو حکومت کے دست برد سے محفوظ رکھتا ہے، اس کے برخلاف اشتراکی تحریک
غیر محدود مسابقت اور مقابلہ کی خرابیوں کو پیش کرتی ہے، اور اس کی وجہ سے سوسائٹی کے
غریب اور غیر مستطیع افراد کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
یہ تعلیم دیتی ہے کہ جب تک ذاتی ملکیت کے حصول پر مناسب قیود نہ عائد کئے جائیں گے
دنیا میں ہمیشہ بے چینی اور افلاس کا دور دورہ رہے گا، تجارت اور صنعت و حرفت میں بے قید
مقابلہ کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کا پہلے سے وسائلِ دولت پر قبضہ ہے وہ اور مزید دولت
حاصل کرتے جائیں، اور جو پہلے سے غریب ہیں وہ اور غریب ہوتے جائیں، کیونکہ مقابلہ میں
ان کا ناکام رہنا یقینی ہے، اس لئے اشتراکی کہتے ہیں کہ اجتماعی پیداوار کے ذرائع اور پیدائشِ
دولت کے آلات کو افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں لے آنا چاہئے تاکہ ان
آلات و وسائل پر کسی خاص گروہ یا طبقہ کا قبضہ نہ رہنے پائے بلکہ جملہ افراد اُن سے یکساں
اور مساوی طور پر فائدہ اٹھاسکیں، یہ نہ ہو کہ کسی کے گھر میں گھی کے چراغ جلیں اور کسی کو دو
وقت روٹی بھی نہ نصیب ہو، اشتراکیت حصولِ دولت کے ذرائع کو مملکت کے قبضہ میں
رکھنا چاہتی ہے، اور اسی طرح افرادِ ملک کی اجتماعی کوششوں سے مجموعی طور پر جو دولت
حاصل ہوتی ہے اس کی تقسیم کو بھی مملکت کے سپرد کر دینا چاہتی ہے تاکہ مجموعی دولت کی تقسیم
انصاف کے ساتھ ہو اور ہر ایک شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق اس کا حصہ ملے، اشتراکیت

معاشی اونچ نیچ اور طبقاتی امتیازات کی دشمن ہے، وہ ایک ایسی سوسائٹی کے قیام پر زور دیتی ہے جس میں طبقوں کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، کیونکہ اس کی نظر میں مختلف طبقوں کا وجود ہی ظلم اور ناانصافی کا اصلی سبب ہے،

ان امور و مقاصد کی حد تک تمام اشتراکی کم و بیش متفق ہیں، لیکن جہاں تک حصولِ مقصد کے لئے ذرائع اختیار کرنے کا سوال ہے، اشتراکیوں میں باہمد گر سخت اختلاف رائے ہے، اور اسی اعتبار سے اشتراکیت کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، انقلابی اشتراکیت اور ارتقائی اشتراکیت، ان دونوں میں خاص فرق یہ ہے کہ ارتقائی اشتراکی معاشی مساوات کے قیام میں رائج الوقت جمہوری نظام ہی سے کام لینا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ موجودہ جمہوری مملکت پر جیسی کچھ وہ ہے اشتراکی خیال کے افراد کو قبضہ کرلینا چاہئے اور وہ اس طرح سے کہ پارلیمنٹ اور مجالسِ قانون ساز میں پروپگنڈے کے ذریعہ اشتراکی پارٹی اکثریت حاصل کرے، اس کے بعد حکومت کی باگ ڈور لامحالہ اشتراکیوں کے قبضہ میں آجائے گی، اور وہ اپنے اقتدار کو استعمال کرکے تدریجی طور پر سوسائٹی کو اشتراکی قالب میں ڈھال لیں گے، ارتقائی اشتراکیت تدریجی اصلاح کی قائل ہے اور چاہتی ہے کہ پارلیمنٹوں اور مجالسِ قانون ساز میں اکثریت حاصل کرکے اپنے مقاصد پورے کرے، اور رفتہ رفتہ ذاتی ملکیت کو محدود کرکے اجتماعی پیداوار کے آلات و وسائل حکومت کے قبضہ میں لے آئے،

انقلابی اشتراکیت جس کا دوسرا نام اشتمالیت یا کمیونزم ہے اس طریقۂ کار کی شدت سے مخالف ہے، کیونکہ وہ موجودہ سیاسی اور جمہوری نظامات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے، اشتمالی یعنی کمیونسٹ کہتے ہیں کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری نظام میں اکثریت حاصل کرکے اشتراکی اصولوں کے مطابق سوسائٹی کی تشکیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر

نہیں ہو سکتا، ہی اس نظام کے اندر رہ کر اشتراکی مقاصد کے حصول کی کوشش بے معنی ہے کیونکہ یہ نظام تو سرمایہ داروں کا ساختہ پرداختہ اور ان ہی کے مفاد کا محافظ ہے، جب تک یہ نظام باقی رہے گا، سرمایہ داروں کا غلبہ بھی باقی رہیگا، اور معاشی اصلاح کی تمام کوششیں لازمی طور پر سرمایہ داروں کے مفاد کی تابع رہیں گی، اگر صحیح معنوں میں اشتراکی سوسائٹی کی تشکیل کا کام انجام دینا ہے تو رائج الوقت سیاسی اور جمہوری نظامات کو برباد کرنا اور مٹانا ہوگا، تب ہی اشتراکی اصول دنیا میں رائج ہو سکیں گے، انقلابی اشتراکیت کا سب سے بڑا فلسفی کارل مارکس نامی ایک جرمن یہودی تھا، اس لئے اشتمالی تحریک یا کمیونزم کو سمجھنے کیلئے مارکس کے فلسفہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے

کارل مارکس کا فلسفہ کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر معاشی نظام اپنے دور کی پوری زندگی کا سنگِ بنیاد ہوتا ہے اور وہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کے ذریعہ سوسائٹی کی معاشی ضروریات بلا کسی دقت یا رکاوٹ کے پوری ہوتی رہتی ہیں، لیکن ایک وقت آتا ہے جبکہ سوسائٹی کا معاشرتی ماحول اور ان تعلقات کی نوعیت جو سوسائٹی کے ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ کے مابین قائم ہوتے ہیں معاشی نظام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگتے ہیں اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ نئی نئی ایجادات کی وجہ سے آفرینشِ دولت کے طریقوں میں تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے وہ طبقاتی تقسیم متاثر ہونی شروع ہوتی ہے، جس پر سوسائٹی اب تک قائم تھی، کیونکہ مارکس کہتا ہے کہ ہر زمانہ میں معاشی کاروبار کی نوعیت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ سماج میں مختلف طبقات مختلف فرائض انجام دیں، اور اپنے فرائض کی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے مجموعی دولت میں حصہ دار بنیں، اس طرح معاشی نظام ہی کی بدولت سوسائٹی چند در چند طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے جس میں سے ہر طبقہ اپنے مقررہ فرائض انجام دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ایک مقررہ معیار کے مطابق اس کی قانونی اور

سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے، اسی لئے ہر زمانہ کا قانونی اور سیاسی نظام اُن سماجی تعلقات اور طبقاتی امتیازات کا محافظ ہوتا ہے، جن کے ذریعہ مختلف طبقوں کی معاشرتی اور سماجی حیثیت متعین ہوتی ہے، اور جب کبھی کوئی طبقہ اپنی متعینہ حیثیت کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو رائج الوقت قانونی اور سیاسی نظام اس کی مخالفت کرتا ہے، ابتدا میں سوسائٹی کا معاشرتی نظام اور اسکی طبقاتی تقسیم معاشی نظام کی کارکردگی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتے ہیں، لیکن ایک خاص مدت کے بعد معاشی نظام اور معاشرتی تعلقات کی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے، اور معاشی نظام کے اندر سے ایسی قوتیں نمود کرتی ہیں جو رائج الوقت معاشرتی تعلقات اور طبقاتی تقسیم کو بدلنا چاہتی ہیں، یا یوں کہئے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد معاشرتی اور سماجی تعلقات کی رائج الوقت شکل وصورت پیدائش دولت کے کام میں مزاحم ہونے لگتی ہے، اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس میں غالب معاشی طبقات ایک طرف ہوتے ہیں اور مغلوب ومظلوم طبقات دوسری طرف، چونکہ سیاست وحکومت پر اول الذکر طبقات کا قبضہ ہوتا ہے اور قانون بھی ان ہی کی مرضی کے مطابق کام کرتا ہے اس لئے یہ طبقے اپنی پوری قوت اور وسائل کے ساتھ رائج الوقت معاشرتی نظام اور طبقاتی تقسیم کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، اس کے برخلاف دوسرے طبقے سماجی تعلقات کی رائج الوقت صورت میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور بالآخر کامیاب ہوتے ہیں، کارل مارکس کے نزدیک پوری تاریخ سوا اس زمانہ کے جب زندگی بالکل ابتدائی شکل میں تھی، مختلف معاشرتی طبقوں کی جنگ کا قصہ ہے، معاشی اور معاشرتی نشوونما کے طریقہ کو کارل مارکس نے یورپ کی تاریخ سے ایک مثال دے کر واضح کیا ہے، پندرہویں صدی میں جاگیرداری نظام رائج تھا اور وہی معاشرتی نظام کی بنیاد تھا، رفتہ رفتہ تجارت کو فروغ ہوا، نئے ملک دریافت کئے گئے، بحری سفر کے نئے راستے معلوم کئے گئے اور اس کے خطرات کم ہو گئے، اس کی وجہ سے معاشی نظام میں یہ فرق پیدا ہوا کہ

ایک طبقہ سرمایہ داروں کا نمودار ہوا جس نے ایک طرف تو قرونِ وسطیٰ کے دستکاروں کو مزدور بنا دیا اور دوسری طرف تجارت کے نئے ذریعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی دولت بہت بڑھا لی، لیکن معاشرتی اور سیاسی نظام میں اس طبقہ کی جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہ اُسے حاصل نہیں ہوئی اور معاشرے اور ریاست پر شرفاء اور امراء قابض رہے، اس سبب سے ان دونوں میں مخالفت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ لڑائی کی نوبت آگئی، بالآخر فرانسیسی انقلاب میں سرمایہ داروں کے طبقے کو شرفاء اور امراء پر فتح حاصل ہوئی مگر اس دوران میں صنعتی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، مشینیں ایجاد ہوئیں، کارخانے قائم ہوئے اور ان کے ذریعہ سے ایک نیا طبقہ مزدوروں کا پیدا ہو گیا، سرمایہ داروں نے شرفاء پر فتح پانے کے بعد معاشرتی زندگی پر اسی طرح قبضہ کر لیا جیسے پہلے شرفا اور امرار نے کیا تھا اور اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، اپنے فائدہ کے لئے وہ مزدوروں پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے ہیں، لیکن مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ رہی ہے، سرمایہ داری کے نظام کو جتنی ترقی ہوگی، اتنی ہی ان کی تعداد اور بھی بڑھتی جائے گی، اور ان کا افلاس بھی بڑھیگا، آخر میں وہ اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ متحد ہو کر سرمایہ داروں کا مقابلہ کریں، اس جنگ میں ان کی کامیابی یقینی ہے اور ان کی کامیابی کے ساتھ ایک نیا معاشی نظام قائم ہوگا جو صنعتی پیداوار کے نئے طریقوں کے مطابق ہوگا، مزدوروں کی فتح کے بعد مارکس کہتا ہے کہ سوسائٹی پر ایک درمیانی مدت گذرے گی جس میں مزدوروں کی آمریت قائم ہوگی، اس آمریت کے ذریعہ طبقاتی امتیازات کو مٹایا جائے گا، اور پیدائشِ دولت کے تمام وسائل، تمام جائدادیں اور املاک افراد کے ہاتھ سے چھین کر حکومت کو دیدی جائیں گی، اس طرح جب طبقاتی تقسیم بالکل معدوم ہو جائے گی تب یہ آمرانہ حکومت از خود اپنے وجود کو ختم کر دے گی اور بغیر کسی حکومتی اقتدار کے انسان اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے لگے گا، کیونکہ مارکس کے

نزدیک حکومت ہمیشہ غالب معاشی طبقوں کے مفادات کی حفاظت کا کام انجام دیتی ہے، جب طبقات ہی باقی نہ رہیں گے تو حکومت کا وجود بھی بے ضرورت ہو جائے گا، صحیح معنوں میں اشتراکی سوسائٹی اسی وقت وجود میں آئے گی جب حکومت اور مملکت کا وجود مٹ چکا ہوگا

اشتراکی تحریک کی مختصر تاریخ

یورپ میں اشتراکیت کی ابتدا ایک جامع اور منظم تحریک کی حیثیت سے اس وقت شروع ہوئی جب ۱۸۴۸ء میں مارکس اور اینجلس نے مل کر وہ مشہور اعلان مرتب کیا جسے "اشتمالی منشور" (Communist Manifesto) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس سے قبل بھی فرانس میں سینٹ سائمن (Saint Simon) اور فوریر (Fourier) جیسے مفکرین اشتراکی عقائد کی تبلیغ کر رہے تھے، اگرچہ ان کا کام زیادہ تر نظری تھا اور اس کا دائرۂ اثر بھی بہت محدود تھا، انگلستان میں رابرٹ اوین (Robert Owen) نے سب سے پہلے اشتراکی خیالات کو عمل کا جامہ پہنانے کی کوشش کی، اوین خود سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اُسے مزدوروں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی، اس نے چند اور سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر گلاسگو شہر کے قریب نیولینارک (New Lanark) کی بستی میں ایک کارخانہ خریدا اور اس میں مزدوروں کی حالت درست کرنے کا کام شروع کیا، اس نے تمام مزدوروں کو ایک جگہ آباد کیا، اتحادی دکانیں کھولیں جن میں وہ اپنی ضروریات کے لئے سامان خرید سکتے تھے، اس نے مزدوروں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا، اور ان کے کام کے اوقات دیگر کارخانوں کے مقابلہ میں بہت کم کر دیئے، یہ تجربہ نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اوین کی سرپرستی میں نیولینارک کے مزدوروں کی حالت بہت سدھر گئی، لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے اُسے یہ کام چھوڑنا پڑا، اس نے اس قسم کے دو چار تجربے اور بھی کئے، اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا، لیکن اوین کے کام کا دائرہ بہت محدود تھا، اور اس میں بھی اُسے بڑی مخالفتوں کا

سامنا کرنا پڑا، اس دور کے اشتراکیوں میں لوئی بلانک (Louis Blanc) بہت ممتاز تھا، اس نے ۱۸۴۸ء میں فرانس کے اس جمہوری انقلاب میں بڑا حصہ لیا جس کے نتیجے کے طور پر لوئی فلپ (Louis Phillippe) کو فرانس کا تخت چھوڑنا پڑا، فوریر اور سینٹ سائمن کے برعکس جن کا دائرۂ کار بہت محدود تھا، لوئی بلانک نے جمہور پر اپنے خیالات کا گہرا اثر ڈالا، اس کا نظریہ یہ تھا کہ مزدوروں کے لئے کام فراہم کرنا حکومت کا ایک ضروری فریضہ ہے، چنانچہ لوئی فلپ کے اخراج کے بعد جو عارضی حکومت قائم ہوئی اور جس میں لوئی بلانک بھی شریک تھا، اس نے قومی کارخانے قائم کئے، جن میں مزدوروں کے لئے کام فراہم کیا جاتا تھا اور اس کام کا انھیں مقررہ معاوضہ دیا جاتا تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں قومی کارخانوں میں کام کرنے کے لئے ایک لاکھ پندرہ ہزار اشخاص کی درخواستیں جمع ہو گئیں، اتنی بڑی تعداد کے لئے کام فراہم کرنا دشوار تھا، بالآخر حکومت نے اس کوشش کو خیرباد کہا اور لوئی بلانک کی کوششیں رائگاں گئیں،

۱۸۶۴ء میں کارل مارکس کی رہنمائی میں مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی مجلس قائم ہوئی جسے "فرسٹ انٹرنیشنل" کہا جاتا ہے، فرسٹ انٹرنیشنل یا پہلی بین الاقوامی مجلس کے تحت یورپ کے مختلف ممالک میں اشتراکی تحریک کی تنظیم کا کام شروع کیا گیا، چنانچہ جرمنی کی مشہور "معاشری جمہوری (Social Democratic) پارٹی" اسی زمانہ میں وجود میں آئی، لیکن جرمنی میں اس پارٹی کے خلاف ایک اور طاقتور پارٹی قائم تھی جس کا رہنما لیسال (LASSAL) تھا، لیسال اور کارل مارکس کے خیالات میں بڑا اختلاف رائے تھا جس کے نتائج بعد میں ظاہر ہوئے، لیسال تدریجی اصلاح کا قائل تھا اور اس کا خیال تھا کہ اشتراکیت کے قیام کے لئے موجود الوقت جمہوری حکومتوں کو قائم رکھنا ضروری ہے، البتہ ان جمہوری حکومتوں کو

صنعت و حرفت اور تجارت میں بیش از بیش مداخلت کرنی چاہئے اور قانون سازی کے ذریعہ
صنعتی نظام کو سرمایہ داروں کی گرفت سے نکال کر اپنے قبضہ میں لینا چاہئے، اس کے برعکس
کارل مارکس موجود الوقت جمہوری حکومتوں کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کو بیکار سمجھتا تھا، وہ
اصلاح کا نہیں بلکہ انقلاب کا قائل تھا، وہ کہتا تھا کہ جمہوری مملکت نظام سرمایہ داری کی
وسعت پذیر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے اور سرمایہ داروں کے مفاد
کی حمایت اس قسم کی حکومت کا ضروری خاصہ ہے، اس کو قبول کرکے اور اس کے اندر رہ کر
اصلاح کی کوشش کرنا محض تضییع اوقات ہے، ۱۸۷۵ء میں گوتھا کانگریس (Gotha
Congress) کے موقع پر جب جرمنی کی "معاشری جمہوری پارٹی" نے لیسال کی قائم کی ہوئی
پارٹی سے مصالحت کرلی، اور اس کے ساتھ شریک ہوکر کام کرنے کا فیصلہ کیا تو مارکس نے
اس فیصلہ پر بہت ناراضی کا اظہار کیا اور "گوتھا پروگرام" پر اس نے جو تبصرہ لکھا اس میں
"جمہوری معاشری پارٹی" کی ارتقائی اشتراکیوں سے مصالحت کو مذموم ٹھہرایا، کیونکہ مارکس کے
خیال میں ان لوگوں کا ساتھ دینا جو جمہوری نظام کو قائم رکھ کر تدریجی اصلاح کے ذریعہ اشتراکیت
قائم کرنا چاہتے ہیں، درحقیقت اشتراکیت کے قیام پر ایک کاری ضرب لگانا ہے،

"فرسٹ انٹرنیشنل" کے تحت فرانس میں بھی اشتراکی تحریک کو منظم کرنے میں مارکس
کے پیروؤں کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، یہ مخالفت زیادہ تر پرودھان (Proudhan)
اور بلانکی (Blanqui) کے حامیوں کی طرف سے عمل میں آئی، پرودھان نراج
کا حامی تھا اور بلانکی کے خیالات اور مارکس کے نظریات میں خاص فرق یہ تھا کہ بلانکی انقلاب
برپا کرنے کے لئے عام مزدوروں میں طبقاتی شعور کی ضرورت کا قائل نہ تھا، اس کا خیال
تھا کہ اگر عام مزدوروں میں انقلاب کی خواہش نہ بھی ہو تب بھی ایک مختصر مگر قوی جماعت

انقلاب پیدا کرسکتی ہے، اس کے برخلاف مارکس کی رائے یہ تھی کہ انقلاب اس صورت میں کامیاب
ہوسکتا ہے جب جمہور اور عام مزدوروں کے اندر سرمایہ داروں کے مقابلہ میں طبقاتی یگانگت
اور شعور پیدا ہوجائے اور وہ انقلاب کو اپنی فلاح کے لئے ضروری خیال کرنے لگیں، فرسٹ
انٹرنیشنل کے انتہائی عروج کا زمانہ وہ تھا جب پروشیا والوں نے نپولین سوم کو سیڈان
(Sedan) پر شکست دی اور فرانس میں جمہوری انقلاب برپا ہوا، اس کے بعد فرسٹ
انٹرنیشنل کا زور کم ہوگیا، ۱۹۰۱ء میں مزدوروں کی دوسری بین الاقوامی مجلس یعنی سکنڈ
انٹرنیشنل قائم ہوئی اور اس میں تمام ممالک کے مزدور نمایندوں نے حصہ لیا، اس زمانہ میں
روس کے اشتراکیوں پر بہت مظالم ڈھائے جارہے تھے اور ان کے اکثر رہنما ملک سے باہر جلاوطن
کردیئے گئے تھے، اس لئے روسی اشتراکیوں کو اپنی تحریک روس سے باہر رہ کر چلانی پڑتی تھی،
روس میں اس وقت تین پارٹیاں تھیں، معاشرتی انقلابی پارٹی (Social Revolutionary party) تعداد میں سب سے زیادہ تھی، اس کے ارکان زیادہ تر
روس کے کسان تھے، لیکن چونکہ کسان ملک میں دور دور منتشر تھے اس لئے اس پارٹی میں
تنظیم کی کمی تھی، دوسری پارٹی بالشویکوں کی تھی جو بڑے بڑے شہروں کے مزدوروں پر مشتمل
تھی اور اس لئے تنظیم اور مرکزیت کے اعتبار سے بہت زیادہ قوی تھی، تیسری پارٹی منشویکوں
کی تھی، یہ لوگ بھی اپنے کو کارل مارکس کا پیرو کہتے تھے، لیکن اُن میں انقلابی اسپرٹ بہت
کم تھی، دراصل یہ پارٹی جرمنی کی "معاشرتی جمہوری پارٹی" کی ہم مسلک تھی، اور موجود الوقت جمہوری
نظام کے اندر رہ کر تدریجی اصلاح کا کام کرنا چاہتی تھی، اس لئے حقیقۃً اس پارٹی کو مارکس کے
خیالات سے کوئی تعلق نہ تھا،

روسی انقلاب ہم بتا چکے ہیں کہ جنگ عظیم سے قبل روس میں تین اشتراکی پارٹیاں قائم تھیں،

یہ تینوں پارٹیاں روسی شہنشاہیت سے بیزار تھیں اور ملک میں ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتی تھیں جس میں عوام الناس مزدوروں اور کسانوں کی حالت سدھاری جا سکے، اس زمانہ کی روسی شہنشاہیت سرمایہ داروں کے مفاد کی حامی اور عوام کے معاشی مصائب سے بے پروا تھی، روس میں نظامِ سرمایہ داری یورپ کے دوسرے ممالک کے بہ نسبت بہت دیر میں قائم ہوا، اور اس کی بنیاد بہت غیر مستحکم تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جنگ عظیم تک روس میں نظامِ سرمایہ داری پورے طور پر قائم ہی نہ ہوا تھا، اس دور کا روسی نظام سرمایہ داری اور جاگیرداری کا ایک نامربوط مجموعہ تھا، روس کی زیادہ تر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی، جو دور دور پھیلے ہوئے تھے، مزدوروں کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ صنعتی کارخانے صرف چند بڑے شہروں تک محدود تھے سرمایہ داری نظام کے مظاہر و خصوصیات سے روس بڑی حد تک ناآشنا تھا، متوسط طبقہ تعداد کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھا، ملک میں یا تو غریب مفلوک الحال کسان بستے تھے یا بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے، حالانکہ انگلستان اور فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں جہاں سرمایہ داری ترقی پذیر تھی متوسط طبقہ خوشحال، کثیر التعداد اور بااثر تھا،

۱۹۱۷ء تک روسی آبادی جنگ سے بیزار ہو چکی تھی، پیہم شکستوں نے ملک میں ہر طرف بدامنی اور انتشار پیدا کر دیا تھا، مارچ ۱۹۱۷ء میں روس میں اچانک انقلاب برپا ہو گیا، یہ انقلاب اتنی سرعت کے ساتھ اور ایسے غیر متوقع طور پر ہوا کہ خود انقلابی اس کے لئے تیار نہ تھے، ۸ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیٹروگراڈ کے کارخانوں کی مزدور عورتوں نے ہڑتال کر دی، اس کے بعد یہ شورش بڑھتی گئی اور پھیلنے لگی، یہاں تک کہ ۱۵ مارچ کو زار نکولاس دوم تخت سے دست بردار ہو گیا، اور کیرنسکی (Kerensky) کے تحت ایک عارضی حکومت قائم ہو گئی، یہ عارضی حکومت اعتدال پسند اشتراکیوں پر مشتمل تھی، ادھر ملک کا یہ حال تھا کہ ہر

طرف سے صلح کا مطالبہ ہو رہا تھا، سپاہی، مزدور، کسان سب کے سب جنگ کی سختیوں اور مصیبتوں سے تنگ آ گئے تھے، اس پر بھی کیرنسکی کی حکومت نے جرمنی سے صلح کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ متحدین کے اصرار سے جرمن فوجوں پر نیا حملہ شروع کر دیا، یہ حملہ بالکل ناکام رہا، اور اب ہر طرف ملک میں بغاوت پھیل گئی، بالشویکوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بڑی دانشمندی سے ملک میں یہ پروپگنڈا کیا کہ اگر حکومت ان کے ہاتھ میں آ جائے تو وہ فوراً جرمنی سے صلح کر لیں گے، علاوہ ازیں انھوں نے کسانوں سے بھی وعدہ کیا کہ اگر انقلاب برپا کرنے میں وہ ان کا ساتھ دیں تو حکومت ملنے پر بڑے زمینداروں سے ان کی زمینیں چھین کر کسانوں میں تقسیم کر دیجائینگی: کاشتکاروں اور کسانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کیا ترغیب ہو سکتی تھی کہ وہ زمینوں کے مالک بن جائیں اور جنگ کی مصیبتوں سے چھٹکارا پائیں، غرضکہ اپنے پروپگنڈے میں بالشویکوں کو بڑی کامیابی ہوئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک کے عام مطالبہ اور صلح کی خواہش کو پورا کرنے پر تیار تھے، بالآخر اکتوبر ۱۹۱۷ء میں کیرنسکی کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اور بالشویکوں کا راج قائم ہو گیا، اقتدار ملتے ہی بالشویکوں نے جرمنی کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا، اور ۱۹۱۸ء میں بریسٹ لٹویسک کی صلح ہو گئی، بالشویکوں کا بڑا لیڈر لینن تھا جس نے کیرنسکی کی اعتدال پسند اشتراکی حکومت کا تختہ الٹ کر مزدوروں کی آمریت قائم کی، کیرنسکی کی عارضی حکومت جمہوری تھی اور متوسط طبقہ کی تائید اور حمایت سے قائم ہوئی تھی، اس لئے وہ متوسط طبقہ کے خیالات اور ارادوں کی حامل تھی، اس کے برعکس لینن نے مزدوروں کی جو آمریت قائم کی وہ متوسط طبقوں کی دشمن اور جمہوری نظام کی سخت مخالف تھی، اس بارے میں لینن سے اُن جرمنی کی معاشرتی جمہوری پارٹی کے ایک ممتاز نمایندہ کارل کاتسکی (Karal Kautzky) سے بہت گرم اور تلخ بحث ہوئی، کارل کاٹسکی کی رائے یہ تھی کہ اشتراکی فلسفہ کی رو سے روسیوں